جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مُدیر

پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

تعارف قاضی گروپ آف کمپنیز

اور اللہ ہی نے تمہارے لئے گھروں کو رہنے کی جگہ بنایا (القرآن)

قاضی انٹرپرائزز 1988 سے پراپرٹی اور کنسٹرکشن کے شعبہ سے منسلک ہیں۔ الحمدللہ جس ادارہ کی بنیاد تقویٰ، توکل، ایمانداری اور جذبہ خدمت خلق پر رکھی گئی تھی اس کو اللہ تعالیٰ نے دن دوگنی رات چوگنی ترقی سے نوازا۔ رب رحیم کا احسان عظیم ہے کہ ادارہ نے اپنے ذیلی اداروں کی محنت اور تعاون سے ترقی کی اور 1999 میں تنظیم نو کرتے ہوئے (قاضی گروپ آف کمپنیز) کا آغاز کیا۔ قاضی گروپ آف کمپنیز میں مندرجہ ذیل ادارے شامل ہیں۔

★ قاضی انٹرپرائزز ★ قاضی کنسٹرکشن ★ قاضی پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز ★ قاضی ڈویلپر ★ قاضی پی وی سی پائپ انڈسٹری ★ اسلامک ویلفیئر فاؤنڈیشن

قاضی انٹرپرائزز ہی کیوں؟ اس لیے کہ

1. ہاؤسنگ کے شعبہ میں بہترین تجربہ کار ٹیم۔ 2. 4 منصوبے مکمل کرنے کا اعزاز حاصل (جہاں یا تو ہمارے ممبران رہائش پذیر ہو چکے ہیں اور یا اپنے پلاٹ فروخت کر کے کئی گنا منافع بھی کما چکے ہیں۔ آپ بھی ہمارے منصوبوں میں سرمایہ کاری کر کے فائدہ اٹھا سکتے ہیں) 3. **منی بیک گارنٹی** ہماری ہی ہے اگر آپ نقشہ دیکھے، مکان / پلاٹ خریدے اور دیکھنے پر آپ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے بتائے ہوئے منصوبے معیار کے مطابق نہیں ہیں تو آپ اپنی رقم واپس لے سکتے ہیں

5. ہر اتوار کو ہماری گاڑی دفتر سے صبح نو بجے سائٹ وزٹ کے لیے روانہ ہوتی ہے اسلئے پہلے آپ سائٹ دیکھیں اور پھر خریدیں

ہمارے منصوبے

★ الرحمٰن ٹاؤن (مکمل) ★ پاسبان ٹاؤن (مکمل) ★ گلستان راشد فیز (I) مکمل ★ فیملی ولاز مری فیز (I) فیز (II) مکمل

★ فیملی گارڈن اسلام آباد بکنگ جاری ★ موٹروے سٹی فیز (I) فیز (II) بکنگ مکمل ★ فیملی اپارٹمنٹ مری فیز (III) بکنگ جاری

★ موٹروے سٹی فیز (III) بکنگ جاری ★ قاضی اپارٹمنٹ راولپنڈی بکنگ جاری ★ اسلام آباد مال گارڈن بکنگ جاری

ہمارا دعوی ہمارے منصوبے سب سے سستے اور سب سے بہترین، دیکھیں اور فیصلہ کریں

موٹروے سٹی

خصوصیات

☆ اسلام آباد کی طرح سرسبز و شاداب پہاڑیوں کے دامن میں

☆ نیو اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ کی بدولت ہر آسائش متوقع

☆ تھیم پارک اور نیشنل پارک جیسی سیرگاہیں قریب تر

☆ انشاءاللہ تعالیٰ تمام ضروریات زندگی آپ کے دروازے پر

☆ پاکستان موٹروے سے چند منٹ کی مسافت

☆ فوج کے ریٹائرڈ افسران پر مشتمل منظم سیکورٹی سسٹم کا قیام

☆ اسلامک سینٹر کے لیے پچاس کنال زمین وقف

☆ قیمتوں میں اضافہ کی بدولت منافع بخش سرمایہ کاری

☆ پانی جیسی نعمت کی فراوانی

☆ ہر فیز میں شاپنگ سینٹر

☆ کشادہ سڑکیں اور گلیاں

☆ مسجد، سکول اور ہسپتال گھر کے نزدیک۔

خصوصی رعایت

29 فروری 2000ء تک

پلاٹ بک کرانے والے کو 15 ہزار روپے فی کنال کی خصوصی رعایت

قیمت و طریقہ ادائیگی

قیمت: 9 ہزار روپے فی مرلہ

ایڈوانس: 1000/- روپے فی مرلہ بوقت بکنگ۔

قسط: 100/- روپے فی مرلہ ماہانہ

سائز پلاٹ 5 مرلہ، 10 مرلہ، ایک کنال

تمام ادائیگی بذریعہ بینک ڈرافٹ بنام موٹروے سٹی اکاؤنٹ نمبر 8- ABL 1100 راشد منہاس روڈ برانچ راولپنڈی

یکمشت ادائیگی پر 10 فیصد خصوصی ڈسکاؤنٹ۔ کل قیمت کی پچاس فیصد یکمشت ادائیگی پر فوری رجسٹری

ہیڈ آفس

قاضی انٹرپرائزز

جنگ بلڈنگ مری روڈ راولپنڈی

فون 554464 فیکس 558633

E-mail: shaukat@isb.comsats.net.pk

web: www.qazi.com.pk

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جلد : ۱۲۶ ' عدد : ۷ ' جولائی ۱۹۹۹ ' ربیع الاول ۱۴۲۰

مدیر: پروفیسر خورشید احمد

نائب مدیر: مسلم سجاد

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ' ملتان روڈ' لاہور

فون : ۵۴۲۵۳۵۶

فیکس : ۷۸۳۲۱۹۴

E-mail: tarjuman@pol.com.pk

مدیر انتظامی

عبدالکریم

۵- اے' ذیلدار پارک' اچھرہ' لاہور

فون : ۷۵۸۷۹۱۶-۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ : ۱۵ روپے

زر سالانہ : ۱۵۰ روپے

بھارت ۳۰۰ روپے

بنگلہ دیش' ایران ۴۵۰ روپے

مشرق وسطیٰ' یورپ

مشرق بعید' افریقہ ۶۵۰ روپے

امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا ۹۰۰ روپے

مسلمانانِ ہند کا نصب العین

فاضل مصنف نے اپنی اس کتاب میں ہندی مسلمانوں کے نصب العین سے بحث کی ہے۔ پہلے تو انھوں نے ہندستان کی تاریخی اور جغرافی تقادیر کی روشنی میں یہ بتایا ہے کہ ہمارے لیے پاکستان' سلطنت اندر سلطنت اور تہذیبی منطقوں والی تمام اسکیمیں مضر اور ناقابل قبول ہیں۔ پھر انھوں نے ہندوؤں کی ذہنی کیفیت کا' نیز ان کی تمدنی اور معاشرتی خصوصیات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملا کر متحدہ قومیت بنانے کا تصور تو درکنار' ان دونوں قوموں کی تہذیبی فطرتوں میں ایسا بعد المشرقین ہے کہ سرے سے کسی طرح کا اتحاد ممکن ہی نہیں اور جو مسلمان زعما اپنی قوتوں کو اس شے نایافتنی کے حصول میں خرچ کر رہے ہیں وہ گویا قضائے مبرم سے لڑ رہے ہیں' اور ان کا یہ کہنا کہ مسلمان بغیر ہندو کا سہارا لیے آزادی کی نعمت کسی طرح حاصل نہیں کر سکتے' انتہائی بزدلی دوں ہمتی اور حقیقت ناشناسی پر دلالت کرتا ہے۔ آخر میں انھوں نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اس وقت ایک اور صرف ایک نصب العین ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ سارے ہندستان پر بلاشرکت غیرے اپنی حکومت قائم کریں۔ خود اسی میں اس پورے ملک کی آزادی کا راز مضمر ہے (ہمارا قومی نصب العین کیا ہونا چاہیے تالیف: خان فضل کریم خان صاحب درانی پر تبصرہ: صدر الدین اصلاحی)۔

اجتہاد : اسلام کسی خاص زمانے کی مذہبی تحریک نہیں ہے جس کی بنیاد وقتی اور مکانی حالات پر ہو۔ بلکہ یہ ایسے اصولوں کا مجموعہ ہے جو انسانی فطرت کے حقائق پر مبنی ہیں اور عام قوانین فطرت کے ساتھ کامل موافقت (harmony) رکھتے ہیں۔ انسان کے حالات اور خیالات خواہ کتنے ہی بدل جائیں' مگر اس کی فطرت ہر حال میں جوں کی توں رہتی ہے۔ زمانہ خواہ کتنے ہی پلٹے کھائے' بہرحال کائنات فطرت کے حقائق اور قوانین میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو فطری اصول طوفان نوحؑ کے وقت انسانی زندگی کے لیے مفید تھے وہی اس بیسویں صدی میں بھی مفید ہیں' اور وہی پانچ ہزار سنہ عیسوی میں بھی منزل سعادت کی طرف انسان کی رہنمائی کے لیے کافی ہوں گے۔ تغیر جو کچھ بھی ہو گا ان فطری اصولوں میں نہیں بلکہ بدلنے والے حالات پر ان کے انطباق (application) میں ہو گا۔ اسلام کی اصطلاح میں اس کا نام اجتہاد ہے' یعنی اصولوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر قانون کی اسپرٹ کے مطابق نئے حالات پر منطبق کرنا۔ اور یہ اجتہاد ہی وہ چیز ہے جو نظام اسلامی کو ایک محرک و متحرک (dynamic) نظام بناتا ہے اور اس کے قوانین کو حالات و ضروریات کے مطابق مرتب (adjust) کرتا رہتا ہے (ابوالاعلیٰ مودودی ' اشارات' ترجمان القرآن ' جلد ۱۴' عدد ۵' جمادی الاولیٰ ۵۸ ۱۳ھ ' جولائی ۱۹۳۹ء)۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

معرکہ کارگل‘ بھارتی جارحیت اور پاکستان

پروفیسر خورشید احمد

کارگل میں اوائل مئی سے جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ بھارتی بری فوج کی مدد سے مجاہدین کے ٹھکانوں کو خاکستر بنانے کے لیے ۲۶ مئی سے بھارتی فضائیہ کے مگ ۲۱‘ ۲۳ اور ۲۷‘ میراج ۲۰۰۰ اور ایم آئی ۱۷ گن شپ ہیلی کاپٹر حرکت میں آگئے ہیں اور ۲۶ مئی سے ہر روز پچاس سے سو بار آگ برسا رہے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ کلسٹر بم استعمال کیے جا رہے ہیں بلکہ کیمیاوی بم بھی داغے گئے ہیں جن کے اثرات خود آزاد کشمیر کے شہریوں پر پڑے ہیں۔ جنگ صرف کارگل‘ دراس‘ بٹالک اور مشکو سیکٹر تک محدود نہیں رہی‘ وادی نیلم اور بھمبر کے علاقوں میں بھی بھارتی در اندازیاں شروع ہو چکی ہیں‘ اور بھارتی فوجی اور سیاسی قیادت ”جنگ جیسی حالت“ (a sort of war) سے آگے بڑھ کر اب کھلی کھلی جنگ کی باتیں کر رہی ہے۔ واجپائی کے دورہ کارگل کے موقع پر اور اس کے بعد ”مکمل جنگ“ (full scale war) کے لیے فضا بنائی جا رہی ہے۔ سابق فوجی اور تجزیہ نگار صاف لفظوں میں کہہ رہے ہیں کہ کنٹرول لائن پار کیے بغیر مجاہدین کو ان کی مضبوط چوکیوں سے نکالنا ممکن نظر نہیں آ رہا اور بھارت آزاد کشمیر اور غالباً پاکستان کی بین الاقوامی سرحد پر بھی اپنی پسند کا میدان جنگ کھولنے کے لیے پر تول رہا ہے۔

پاکستان کے لیے یہ لمحہ بڑا فیصلہ کن ہے۔ وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ۱۹۶۵ء‘ ۱۹۷۱ اور ۱۹۸۴ کے تجربات کی روشنی میں‘ ہر خوش فہمی سے نجات پاتے ہوئے‘ پوری حقیقت پسندی اور مومنانہ فراست کے ساتھ سر پر منڈلاتے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے صحیح عسکری‘ سیاسی اور سفارتی حکمت عملی بنائی جائے اور اس پر قومی اتفاق رائے پیدا کر کے پوری قوم کو ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے منظم اور متحرک کیا جائے۔

سب سے پہلی ضرورت حالات کے صحیح تجزیے کی ہے تاکہ محض غلط فہمیوں اور خوش خیالیوں میں گم

رہ کر، ہم کوئی چوٹ نہ کھا جائیں۔

بھارت کے اصل عزائم کے بارے میں کسی خوش فہمی کی کوئی گنجایش نہیں۔ اس نے اعلان لاہور کے بعد ہی اگنی دوم کا تجربہ اور پوکھراں کی جنگی مشقیں کر کے واضح پیغام دے دیا تھا، لیکن پاکستان کی قیادت دوستی کے خواب دیکھتی رہی اور تجارت کے خیالی پلاؤ پکانے میں مصروف رہی۔ خدا بھلا کرے مجاہدین کا کہ انھوں نے اپنی قوت ایمانی، جہادی فراست اور بیش بہا قربانیوں سے ایک بار پھر حالات کا پانسہ پلٹ دیا ہے۔ انھوں نے ۱۹۸۹ سے اپنی جہادی سرگرمیوں کے ذریعے مسئلہ کشمیر کو اس تابوت سے نکال کر ایک زندہ مسئلہ بنایا جس میں بھارت اور پاکستان کی قیادتوں نے تاشقند اور شملہ معاہدوں کے ذریعے بند کر دیا تھا۔ اب کارگل کی فلک بوس چوکیوں پر قبضہ کر کے اور بھارت کی سری نگر سے لیہہ، لداخ اور سیاچین کے لیے رسد کی شاہراہ کو اپنی گرفت میں لے کر کشمیر میں بھارت کی جارحیت کو ایک بار پھر چیلنج کیا ہے۔ اس سے جدوجہد آزادی ایک نئے اور فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گئی ہے۔ مجاہدین کے اس کارنامے نے بھارت کی عسکری اور سیاسی کمزوریوں کا پردہ چاک کر کے پوری دنیا کے سامنے اس حقیقت کو واشگاف کر دیا ہے کہ جموں و کشمیر کے عوام بھارت کے ناجائز قبضے کے خلاف برسرجنگ ہیں۔ بھارت کی فوج کو دنیا کی چوتھی بڑی فوج ہونے کا دعویٰ ہے۔ اس کے ۷ لاکھ سورما چند ہزار مجاہدین سے دس سال سے برسرپیکار ہیں۔ اس نے دسیوں بار دعویٰ کیا ہے کہ "تحریک مزاحمت دم توڑ چکی ہے" اور "حالات معمول پر آگئے ہیں" مگر اسے تحریک جہاد کے ہاتھوں ہر بار نئی ہزیمت اٹھانا پڑ رہی ہے۔

معرکہ کارگل کا حال یہ ہے کہ چند سو مجاہدین نے بھارت کی ۳۰ ہزار فوج کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ اس معرکے میں ۲۰ ہزار تازہ دم فوجیوں، دہرہ دون کیڈٹ افسروں کی پوری کھیپ اور توپ خانے کے ساتھ فضائیہ کو بھی جنگ میں جھونک دیا گیا ہے، لیکن عالم یہ ہے کہ وہی بھارتی وزیر دفاع جنھوں نے مئی کے شروع میں دعویٰ کیا تھا کہ ۴۸ گھنٹے میں "دراندازوں" کا صفایا کر دیا جائے گا، اب بغلیں جھانک رہے ہیں۔ فضائیہ کے سو جہازوں کی لام بندی اور ان کی ۲۴ مئی سے روزانہ مسلسل آتش فشانی کے باوجود کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں کی جا سکی ہے۔ فوجی قیادت اب چند مہینوں کی بات کر رہی ہے اور طاقت کے اس عظیم عدم توازن کے باوجود کوئی پیش قدمی نہیں کر پا رہی ہے۔ نتیجتاً اب یہی قیادت کنٹرول لائن توڑنے، آزاد کشمیر کی سرحد پر نیا محاذ کھولنے، جموں میں فوجی مشقیں کرنے اور پنجاب اور سندھ کی سرحدوں پر فوج جمع کرنے کی کارروائیاں کر رہی ہے اور زخمی سانپ کی طرح بل کھا کھا کر حملہ آور ہو رہی ہے۔

ان حالات اور واقعات پر تدبر کی نگاہ ڈالنے سے کچھ نتائج سامنے آتے ہیں جن کا ادراک ضروری ہے۔

۱۔ پاک بھارت تعلقات کے سلسلے میں مرکزی حیثیت مسئلہ کشمیر کو حاصل ہے اور کوئی ایسی حکمت عملی جو مسئلہ کشمیر کے حل کے بغیر تعلقات کو معمول پر لانے پر مبنی ہو' ناقابل عمل اور ناقابل فہم ہے۔ جب تک کشمیر کا مسئلہ کشمیر کے عوام کی مرضی کے مطابق اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں حل نہیں ہوتا' دوستی کی راہ پر کوئی قدم بار آور نہیں ہو سکتا۔

۲۔ اعتماد پیدا کرنے والے اقدامات (CBMs) ایک خیالی سواری ہیں جن کی پشت پر کوئی سفر طے نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا ذکر اعلان تاشقند سے اعلان لاہور تک ہر معاہدے میں موجود ہے لیکن یہ صرف کاغذی پھول ہیں اور سراب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اعتماد اور دوستی اسی وقت وجود میں آ سکتی ہے جب کشمیر پر بھارت کا غاصبانہ قبضہ ختم ہو اور بھارت علاقے پر بالادستی کا رویہ ترک کر کے برابری کے اصول پر معاملہ کرنے کو تیار ہو۔ ورنہ ان سی بی ایمز کی حیثیت "بغل میں چھری اور زبان پر رام رام" کے سوا کچھ نہیں۔

۳۔ مسئلہ کشمیر محض بھارت اور پاکستان کے درمیان کوئی تنازع نہیں۔ اس کے چار فریق ہیں اور ان چاروں کی شرکت ہی سے مسئلہ طے ہو سکے گا۔ یعنی بھارت' پاکستان' جموں و کشمیر کے عوام اور اقوام متحدہ اور عالمی برادری۔ تاشقند' شملہ اور پھر لاہور میں اس چار فریقی معاملے کو بھارت اور پاکستان کا دو طرفہ معاملہ بنانے کی غیر حقیقی کوشش ہوئی جسے ناکام ہی ہونا تھا۔ نہ معاہدۂ تاشقند نے مسئلے کے حل کا کوئی دروازہ کھولا' نہ شملہ معاہدے نے اور نہ اعلان لاہور نے بلکہ جیسا کہ خود واجپائی صاحب نے اعتراف کیا ہے "لاہور کی سڑک کارگل میں جا نکلی" (دی ایشین ایج' لندن' ۱۵ جون ۱۹۹۹' ص ۲۰)۔

مسئلہ کشمیر اس بند گلی میں طے نہیں ہو سکتا۔ یہ بازوے شمشیر سے طے ہو گا یا پھر بین الاقوامی مداخلت اور دباؤ سے' جس کا بظاہر امکان کم ہے لیکن اس کے لیے کوشش جاری رہنی چاہیے۔ مگر یہ ذہن میں رہے کہ کشمیر کے عوام اور ان کے عزائم اور احساسات کو نظرانداز کر کے محض دو طرفہ مذاکرات سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ خاص طور پر اگر عوامی اور جہادی قوتوں کا بھارت پر حقیقی دباؤ نہ ہو تو وہ بات بھی کرنے کو تیار نہیں ہو گا۔ دو طرفہ سفارت کاری پہلے بھی ناکام رہی ہے اور آج بھی غیر موثر ہے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ نے دہلی جا کر دیکھ لیا کہ بھارت کا اصل رنگ کیا ہے۔ بقول روزنامہ انڈی پنڈنٹ لندن کے نامہ نگار پیٹر پوفم: یہ ملاقات جدید سفارتی تاریخ کی سرد ترین ملاقات (one of the frostiest encounters in recent deplomatic history) تھی جس کے بعد نہ کوئی مشترک اعلانیہ آیا نہ کوئی مصافحہ ہوا اور نہ ہی کوئی ذاتی ملاپ وجود میں آیا--- بس جھوٹوں کو آنکھیں چار ہوئیں اور قصہ ختم' جس کا اعتراف خود بھارتی وزیر خارجہ نے کیا:

"There was no joint communique, no handshake, barely any eye-contact and no dialogue, as Mr. Singh freely admitted".

نہ معلوم ہمارے وزیراعظم صاحب کو کیا شوق چرایا کہ وزیر خارجہ کو دہلی بھیج کر یوں جگ ہنسائی کا اہتمام کیا۔ قومی اسمبلی کی کشمیر کمیٹی کے چیرمین' خود حکومتی پارٹی کے چودھری سرور صاحب بھی کہنے پر مجبور ہوئے کہ "سرتاج عزیز کے دورہ بھارت سے ہماری بے عزتی ہوگی۔ یہ دورہ ہمارے قومی وقار میں کمی لائے گا" (جنگ' لندن' ۴ جون ۱۹۹۹' ص ۲)۔

۴۔ پاک بھارت تعلقات میں قیادت کے ذاتی تعلقات اور personal chemistry کا کوئی کردار نہیں۔ یہ قومی مفاد اور زمینی حقائق پر مبنی ہیں اور مسکراہٹیں' معانقے' شاعری اور بس نوردی ان کی شیرازہ بندی نہیں کر سکتے۔ جو قیادت اس زعم میں مبتلا تھی کہ ہم نے فلاں دل جیت لیا ہے اور فلاں سے دوستی کے بندھن باندھ لیے ہیں' ان کے خوابوں کا شیش محل بہت جلد چکنا چور ہو گیا ہے۔ اب اسے خواب و خیال کی دنیا سے نکل آنا چاہیے۔ معاملہ خواہ واجپائی جیسے گرگ باراں دیدہ کا ہو یا کلنٹن جیسے دل پھینک سیاست دان کا۔ بقول اقبال ؂

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

۵۔ ایک اور چیز جو اس پورے معاملے میں سب سے زیادہ ابھر کر سامنے آئی ہے وہ یہ حقیقت ہے کہ مسئلہ کشمیر محض زمین کا تنازع نہیں۔ یہ ایک کروڑ ۴۰ لاکھ انسانوں کی آزادی اور ان کے سیاسی مستقبل کا معاملہ ہے۔ اہل کشمیر کے جذبات' احساسات' عزائم' قربانیوں اور خواہشات سے صرف نظر کر کے مسئلے کے حل کی طرف کوئی ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکتا۔ بھارت کا یہ دعویٰ کہ مسئلہ کشمیر محض پاکستان کا چھوڑا ہوا شوشہ ہے اور جہاد کشمیر آئی ایس آئی کا شعبدہ ہے' اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ اور سب سے بڑا دھوکا ہے۔ کشمیر کے عوام نے کبھی بھارت کے تسلط کو قبول نہیں کیا۔ جس اسمبلی کا ڈھونگ ۱۹۵۳ میں رچایا گیا تھا' اس کی نہ عوام کی نگاہ میں کوئی وقعت تھی (۷۵ میں سے ۷۳ افراد بلامقابلہ کامیاب ہوئے تھے) اور نہ اس شخص کی نگاہ میں جس نے خود یہ ڈراما رچایا تھا یعنی شیخ عبداللہ۔ شیخ صاحب نے بعد میں اپنی سوانح حیات میں اسے ڈھونگ قرار دیا۔ وہ اس نام نہاد اسمبلی کے کارفرما ہونے سے پہلے ہی بیک بینی و دوگوش ایوان اقتدار سے زنداں خانے پہنچا دیے گئے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے ایک باقاعدہ قرارداد کے ذریعے اسے کشمیر کے مستقبل کے فیصلے اور استصواب رائے کے باب میں غیر متعلق اور غیر موثر قرار دیا۔ ویسے تو سارے ہی انتخاب غیر نمایندہ تھے لیکن ۱۹۸۷ کے انتخابی ڈھونگ کے بعد تو عوام نے بیلٹ کے راستے

سے کھلی برأت کا اظہار کیا اور مزاحمت اور جہاد کا راستہ اختیار کیا جو آج تک جاری ہے۔

کارگل کے معرکے کی شکل میں تحریک مزاحمت و جہاد نے ایک نئی وسعت اختیار کی ہے۔ کل جماعتی حریت کانفرنس اور مقبوضہ کشمیر کی تمام سیاسی قوتوں نے برملا اعلان کیا ہے کہ کارگل کے مجاہد کشمیر کی جہاد آزادی کے فرزند اور قوم کے ہیرو ہیں۔ بھارت چاہے انھیں "گھس بیٹھیے" کہے یا "درانداز" "طالبان" یا "پاکستان کے فوجی" لیکن حقیقت میں وہ تحریک آزادی کے گل ہائے سرسبد ہیں۔ سیاسی اور عسکری تحریک سرزمین جموں و کشمیر کی اپنی تحریک ہے، کوئی بیرونی دخل اندازی نہیں۔ اس سلسلے میں بھارت کا پروپیگنڈا جو بھی ہو، حقائق بالکل مختلف ہیں جو اپنا لوہا منوا لیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ پاکستان کی سفارتی اور پروپیگنڈا مہم ایسی بودی اور غیر موثر ہے کہ ان حقائق تک کو موثر انداز میں پروجیکٹ نہیں کر پاتی اور بھارت کا یہ حال ہے کہ وہ جھوٹ کو بھی بڑے طمطراق سے پیش کر رہا ہے اور اس اصول پر پیش کر رہا ہے: "جھوٹ کو مسلسل پیش کیے جاؤ حتیٰ کہ لوگ اس کو سچ مان لیں"۔

بھارت کشمیر کو اپنا "اٹوٹ انگ" کہتا ہے جب کہ اہل جموں و کشمیر اس کے قبضے کو ناجائز اور جارحانہ تسلط قرار دیتے ہیں اور اقوام متحدہ اور تمام انصاف پسند انسان کشمیر کو بھارت کا حصہ نہیں، ایک متنازع علاقہ قرار دیتے ہیں۔ مزاحمت کی تحریک ایک قومی تحریک ہے جس کا اعتراف کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ پچھلے دنوں بھارت نے اس پر دھول ڈالنے کی بڑی کوشش کی لیکن معرکہ کارگل نے ایک بار پھر اس حقیقت کو واشگاف کر دیا ہے۔

۱۹۹۰ میں تحریک کے اولیں دور ہی میں تحریک جہاد کی حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ لندن کے اخبار گارڈین کے نمایندہ ڈیرک براؤن نے ۲۸ جنوری ۱۹۹۰ کی اشاعت میں اعتراف کیا تھا: میرا خیال ہے کہ غیر ملکی نامہ نگار، سرکاری موقف سے، یعنی یہ کہ سارا مسئلہ مٹھی بھر ناپسندیدہ عناصر کا کیا دھرا ہے جنھیں پاکستان سے مدد اور حوصلہ افزائی ملتی ہے، جس طرح اختلاف کرتے تھے، وہ بھارتیوں کے لیے بڑی پریشانی کا باعث ہوا۔ غیر ملکی نامہ نگاروں میں اس سے بہت زیادہ مقبول یہ نقطۂ نظر تھا کہ صورت حال عام بغاوت کی کیفیت سے مشابہہ ہے اور اسے عوامی حمایت کی وسیع بنیاد حاصل ہے۔

لندن ٹائمز میں کرسٹوفر تھامس نے یکم فروری ۹۰ کے شمارے میں لکھا: بھارت کی جانب سے صورت حال کو یوں پیش کرنا کہ کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے پاکستان کے اکسانے پر ہو رہا ہے، اس حقیقت کو نظرانداز کرنا ہے کہ علاحدگی کی تحریک کو وسیع عوامی حمایت حاصل ہے۔

اسی طرح فنانشنل ٹائمز نے لکھا: بھارت کا یہ دعویٰ کہ پاکستان نے ساری بے چینی پیدا کی ہے اور مسلح اور تربیت یافتہ درانداز سرحد پار سے بھیجے ہیں، غیر ثابت شدہ ہے اور اس کا درست ہونا قرین قیاس

نہیں ہے۔

لندن اکانومسٹ نے اس تحریک کے آغاز ہی میں لکھا: انتخاب کی آزادی دی جائے تو کشمیری غالباً آزادی کے حق میں یا پھر پاکستان کے حق میں رائے دیں گے۔

اس پورے عرصے میں بھارت نے کشمیر کو عالمی ذرائع ابلاغ کے لیے ممنوعہ علاقہ (no go area) بنا دیا تھا اور آج بھی کوئی اخبار نویس بہ مشکل ہی کشمیر کی صحیح صورت حال سے دنیا کو واقف کرا سکتا ہے۔ وہاں پاکستانی ٹی وی پر بھی پابندی ہے اور بین الاقوامی نمایندوں' ٹی وی کیمرہ مینوں اور این جی اوز کسی کا بھی گزر ممکن نہیں۔ اس معرکے کی وجہ سے کچھ حالات سامنے آ رہے ہیں تو جو تصویر بنتی ہے وہ بھارت کے پروپیگنڈے کا پردہ چاک کرنے والی ہے۔

دی گارڈین لندن کی نمایندہ سوزین گولڈن برگ سری نگر سے ۷ جون ۱۹۹۹ کے شمارے میں لکھتی ہے: وادی کشمیر میں' اس پہاڑی سلسلے سے ۱۲۵ میل دور جہاں بھارت ۱۹۷۱ کے بعد پاکستان کے خلاف سب سے زیادہ اسلحہ اور فوج جمع کر رہا ہے' بھارتی سپاہیوں سے کوئی ہمدردی نہیں پائی جاتی جن کی لاشیں بلندیوں پر لاوارث پڑی ہوتی ہیں' اس لیے کہ ان کو حاصل کرنا زیادہ خطرناک ہو سکتا ہے۔ ایک کشمیری سینیر پولیس افسر نے کہا کہ لوگ بھارتی سپاہیوں کی پریشانیوں سے لطف لے رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "بھارتی فوج اتنے عرصے سے ہمیں قتل کر رہی ہے' اب کچھ انھیں بھی قتل ہونا چاہیے"۔ فوجی افسران میں جوانوں کے مورال کے بارے میں اندیشے بڑھ رہے ہیں۔ انھیں مقامی آبادی کا اعتماد حاصل نہیں ہے جو بغاوت کے آغاز کے بعد سیکیورٹی فورسز کے ہاتھوں ۲۵ ہزار افراد کے قتل کا انتقام چاہتے ہیں۔ سری نگر میں علاحدگی پسندوں نے کنٹرول لائن کے ساتھ ساتھ بھارتی فضائیہ کے استعمال کے خلاف ہڑتال اور مظاہروں کی ہدایت جاری کی ہے۔

لندن کے اخبار دی انڈی پنڈنٹ کا نمایندہ پیٹر پوفام ۲۷ مئی ۱۹۹۹ کے شمارے میں دہلی سے لکھتا ہے: لیکن آبادی ۹۰ فی صد مسلمان ہے اور ۱۹۹۰ کے آغاز سے جب سے کہ بھارتی حکومت نے انھیں دبانے کے لیے وحشیانہ طریقے اختیار کیے ہیں' یہ مسلمان بہت زیادہ بددل ہو گئے ہیں۔ پاکستان کا ہمیشہ یہ موقف رہا ہے کہ کشمیر اس کا ہے۔ بھارت نے کشمیر کو علی حالہ برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے لیے بغاوت کے آغاز ہی سے یہ ایک ہاری ہوئی جنگ ہے۔ یہ خوب صورت اور معروف خطہ ارضی مسلح افواج کا کیمپ بنا ہوا ہے۔

نیویارک ٹائمز اپنے ایک اداریے میں جو انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون کی ۲۸ مئی ۱۹۹۹ کی اشاعت میں شائع ہوا ہے' لکھتا ہے: کشمیر کی مسلم اکثریت کی ریاست طویل عرصے سے بھارت سے آزادی کے حصول

کے لیے گوریلا بغاوت کا منظر پیش کر رہی ہے۔

لندن کے جریدے دی اکانومسٹ نے اپنے ۱۲ جون کے شمارے میں Kashmir Again کے عنوان سے اداراتی کالم میں لکھا ہے: بھارت طویل عرصے سے یہ کہہ رہا ہے کہ اگر پاکستان مداخلت بند کر دے تو کشمیر میں امن قائم ہو جائے گا' اسے زیادہ سے زیادہ نصف سچائی کہہ سکتے ہیں۔ بھارت نے اپنی حکمرانی کے خلاف ایک عرصے سے جاری بغاوت کو قابو کر لیا ہے۔ اب مقامی جنگجو کم اور بیرونی مداخلت کار زیادہ نظر آتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کشمیر میں حالات معمول پر آگئے ہیں یا اس کے عوام بھارتی حکومت کے تحت راضی ہیں۔ زیادہ تر مسلمان بھارت یا پاکستان کی حکومت کے بجائے آزادی چاہتے ہیں مگر بھارت ان کا یہ حق سختی سے مسترد کر رہا ہے۔

اور جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ بھارت کے روزنامہ دی ہندو گروپ کے میگزین فرنٹ لائن کے تازہ شمارے (۱۸ جون' ۱۹۹۹) میں اس کا نمایندہ پراوین سوامی سری نگر سے اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے کہ کارگل کے معرکے کے بعد' اگر یہاں مزاحمتی قوتوں کا قبضہ باقی رہتا ہے تو پاکستان اور پاکستان نواز گروہ یہ دعویٰ کر سکیں گے کہ بھارت مخالف تحریک ریاست کے ان تمام علاقوں پہ چھا گئی ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ سوامی لکھتا ہے: آل پارٹیز حریت کانفرنس کے ایک حالیہ خصوصی اجلاس منعقدہ سری نگر میں کارگل میں بھارت کی دفاعی سرگرمیوں کی مذمت کی گئی اور کہا گیا کہ بری اور فضائی طاقت کے بے روک استعمال نے علاقے میں امن کے لیے خدشات کو بڑھا دیا ہے۔ بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے کہا کہ کارگل میں کشمیری النسل باغی' نہ کہ پاکستان کے فوجی اور غیر فوجی' مورچوں میں ہیں۔ کانفرنس کے بیان میں کہا گیا ہے کہ اب جب کہ کشمیری جنگجوؤں کو کچلنے کے لیے بری افواج کی مدد کے لیے فضائیہ کو بھی بلا لیا گیا ہے' کشمیر کے مسئلے نے جنوبی ایشیا کے علاقے کی سلامتی اور امن کے لیے ایک نئی حیثیت اختیار کر لی ہے (ص ۲۴)۔

سوامی اس امر پر حیرت کا اظہار کرتا ہے کہ فاروق عبداللہ کے سوا کسی کشمیری لیڈر نے حتیٰ کہ نیشنل کانفرنس کے لیڈروں نے بھی "پاکستانی جارحیت کی مذمت نہیں کی" اور سب نے سوچی سمجھی خاموشی کا راستہ اختیار کیا۔ وہ لکھتا ہے: معلوم ہوتا ہے کہ نمایاں سیاسی شخصیات کے پاس کارگل میں لڑائی کے بارے میں کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ ہمیشہ کی طرح فاروق عبداللہ نے پاکستانی جارحیت کی مذمت کی ہے لیکن نیشنل کانفرنس کے دوسرے رہنماؤں نے حالیہ واقعات پر خاموشی اختیار کی ہے۔ وزیراعلیٰ کے علاوہ کسی بڑی سیاسی شخصیت نے جنگ کے علاقے کا دورہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اس مسئلے پر کہ اس موسم گرما کے واقعات ریاست کے مستقبل پر کیا اثرات مرتب کریں گے' کوئی سیاسی مباحثہ کرنے کی کوشش

بھی نظر نہیں آتی۔

بھارت کی ۱۵ کور کے کمانڈر جنرل کرشن پال نے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں اعتراف کیا ہے کہ فوج بغاوت کچلنے میں مصروف ہے مگر اسے مقامی آبادی کی حمایت حاصل نہیں ہے (بحوالہ امت کراچی' ۲۷ مئی ۱۹۹۹ مضمون: ارشاد محمود' "بھارت یہ جنگ نہیں جیت سکتا")۔

حقیقت یہ ہے کہ کشمیر میں اصل بیرونی مداخلت کار (external interventionist) اور جارح (agressor) بھارت اور اس کی افواج ہیں جن کا مقابلہ پوری ملت کشمیر اور اس کے بازوئے شمشیرزن تحریکات جہاد سے ہے۔ بھارت پاکستان پر انگشت نمائی کر کے حقائق کو غیر موثر نہیں بنا سکتا۔ اصل مسئلہ اس کے ناجائز تسلط اور غاصبانہ قبضے سے کشمیر کی رہائی کا ہے۔ اپنے حق آزادی کے لیے جدوجہد' تخریب کاری نہیں' جہاد آزادی ہے جس کی معاونت اور تائید تمام آزادی پسند اور جمہوریت کی علم بردار قوتوں اور افراد کو کرنا چاہیے۔ جہاد آزادی کی تائید اور معاونت کرنے والے' انسانیت کے محسن اور مظلوموں کے مددگار ہیں' دہشت گرد اور تخریب کار نہیں۔

انقلاب فرانس اور عالمی جمہوری تحریک کا فلسفہ اور پیغام یہی ہے۔ یورپی اقوام اور امریکہ کی تحریکات آزادی اور بل آف رائٹس بھی اسی بنیاد پر قائم ہیں۔ اقوام متحدہ کا چارٹر اور ہیومن رائٹس کنونشن کی روح یہی اصول ہے اور غیر جانب دار ممالک (NAM) کا چارٹر اسی اصول کا علم بردار ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ اصول ان کا جزو ایمان ہے۔ اسلام کا تصور جہاد اس کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن صاف لفظوں میں کہتا ہے: وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ج وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ج وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ○ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ج وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ج اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ○ (النساء ۴: ۷۵-۷۶)

آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں' عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔ جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے' وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنھوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے' وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں' پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں۔

بھارت کے پروپیگنڈے کا سارا زور تین باتوں پر ہے۔ ایک یہ کہ کشمیر بھارت کا حصہ ہے اور کشمیر

میں جہادی سرگرمیاں بھارت پر حملے کے مترادف ہیں۔ دوسری یہ کہ کارگل اور کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ پاکستان کے لوگ' پاکستان کی فوج' یا افغان طالبان کر رہے ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ پاکستان نے خصوصیت سے کارگل کے معاملے میں شملہ معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے اور کنٹرول لائن کے اس پار کارروائی کی ہے۔

افسوس ہے کہ پاکستان کی حکومت اور اس کے سفارت کار عالمی سطح پر بھارت کی پروپیگنڈا مہم کا کوئی موثر توڑ نہیں کر رہے اور ہمارا مضبوط مقدمہ محض پیروی نہ کیے جانے کی وجہ سے غیر موثر ہو رہا ہے یعنی انگریزی محاورے کے مطابق: going by default۔

پہلی بات کا واضح جواب یہ ہے کہ کشمیر بھارت کا حصہ نہیں اور نہ کشمیر کی کنٹرول لائن کوئی بین الاقوامی سرحد ہے۔ جموں و کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ اس کے عوام کو کرنا ہے۔ یہ پورا معاملہ پاکستان اور بھارت ہی نہیں' اقوام متحدہ اور بین الاقوامی قانون کی میزان میں متنازع ہے۔ اس طرح یہ مسئلہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے اور کوئی معاہدہ اسے پاکستان اور بھارت کا دو طرفہ معاملہ (bilateral issue) نہیں بنا سکتا۔

بھارتی اخبار ایشین ایج کے ایڈیٹر ایم جے اکبر ۵ جون ۱۹۹۹ کی اشاعت میں شائع ہونے والے اپنے مضمون The Blind Hawks of BJP میں کہتے ہیں: پاکستان کو کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ میں لے جانا نہیں ہے' یہ پہلے ہی سے وہاں ہے۔ اس کا کام تو اسے سرگرمی سے متحرک کرنا ہے۔

ایک اور بھارتی روزنامہ دی ہندوستان ٹائمز کا مقالہ نگار براہما چیلینی اخبار کی ۲ جون ۹۹ کی اشاعت میں Blundering on Kashmir کے عنوان سے لکھتا ہے: نہرو سے واجپائی تک' کم نظری کی وجہ سے کشمیر میں غلطیوں پر غلطیاں ہوئی ہیں۔ کشمیر کو بین الاقوامی' پاکستان نے نہیں' نہرو نے بنایا--- برعظیم میں ایٹمی دھماکوں کے بعد کشمیر پر بین الاقوامی توجہ اسلام آباد کے لیے سفارتی خوش قسمتی تھی تو کارگل سفارتی ضرب کاری ہے' اس نے کشمیر کو سامنے کی چیز بنا دیا۔

عالمی پریس پر نگاہ ڈالیں تو ہر طرف اس امر کا اعتراف ہے کہ کارگل کی وجہ سے مسئلہ کشمیر عالمی توجہ کا مرکز بن گیا ہے اور کوسووا میں امریکہ' نیٹو اور خود اقوام متحدہ نے جو نیا اصول اپنایا ہے اس نے کشمیر کے مسئلے کو عالمی مداخلت کے لیے ایک موزوں ایشو بنا دیا ہے۔ افسوس ہے کہ بھارت اس کے باوجود اپنے پروپیگنڈے کے تیر ہر طرف چلا رہا ہے اور پاکستان کو عالمی سفارتی میدان میں یکہ و تنہا کر رہا ہے جب کہ پاکستان کے سفارت کار خواب غفلت کا شکار ہیں۔ حتیٰ کہ امریکہ میں پاکستان کے سفیر نے بھارت کے سفیر کے مقابلے میں سی این این کے کیو اینڈ اے پروگرام میں بھارتی سفیر کے جھوٹے دعووں کا کوئی رد تک نہ

کیا اور اقوام متحدہ کی قراردادوں اور اہل کشمیر کے حق خود ارادیت کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ افسوس ہے کہ کارگل کے مسئلے پر دنیا کے بیشتر اخبارات و رسائل نے جو بات کہی' ہم اس سے بھی فائدہ نہ اٹھا سکے۔

انگلستان کا روزنامہ فنانشل ٹائمز اپنی ۲۸ مئی ۱۹۹۹ کی اشاعت میں ادارتی کالم میں War in Kashmir کے عنوان سے لکھتا ہے: یہ جاننا ناممکن ہے کہ بھارت کا یہ موقف کہاں تک درست ہے کہ کنٹرول لائن کے اس طرف کے علاقے میں افغان گوریلوں نے نفوذ حاصل کر لیا ہے۔ لیکن یہ واضح ہے کہ مستعفی ہندو قوم پرست حکومت کو کشمیر کے بحران سے انتخابی فائدہ ہو گا۔ ایسی پس منظر کی وجہ سے بیرونی دنیا کا بھی بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔ بھارت نے ہمیشہ اس تنازعے کو بین الاقوامی بنانے سے احتراز کیا ہے لیکن اسے قابو رکھنے میں دنیا کا مشترک مفاد ہے۔ یہ ٹھیک اس نوعیت کا مسئلہ ہے جس کے لیے ضرورت ہے کہ ایک مضبوط اقوام متحدہ کثیر طرفی طریقہ اختیار کرے۔

لندن کا روزنامہ دی ٹائمز اپنے ۲۷ مئی ۹۹ کے اداریے میں کہتا ہے: جب کہ دوسرے کردار کوسووا کے واقعات میں مصروف ہیں' بھارت اور پاکستان کشمیر میں نئی مسلح کشمکش کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

دی گارڈین نے ۲۹ مئی ۹۹ کے اداریے میں لکھا: کوسووا کی جنگ یورپ کے دروازے پر ہے لیکن کسی کو بھی نصف دنیا دور ایک دوسرے مسئلے کے خطرے کو کم نہیں سمجھنا چاہیے جو قابو سے باہر ہونے کی دھمکی دے رہا ہے۔ برطانیہ اور دوسری بڑی طاقتوں کو برعظیم میں ایٹمی خطرے کے بارے میں اپنے حصے کی ذمہ داری ادا کرنا چاہیے۔

دی انڈی پنڈنٹ نے ۲۹ مئی ۹۹ کے اداریے میں کوسووا اور عراق میں اقوام متحدہ کی مداخلت' صلح کاری اور انسانیت کے خلاف جرائم پر احتساب کا ذکر کرنے کے بعد لکھا: اور یہ ایک ایسا طے شدہ اصول (doctrine) ہے جس کا اطلاق کشمیر کے مسئلے پر کیا جا سکتا ہے جو کبھی بھی اقوام متحدہ کے ممبر ممالک کے درمیان ایک سادہ سرحدی تنازع نہیں تھا اور نہ اتنی بات تھی کہ ایک صوبہ دراصل کس کا ہے۔ اقوام متحدہ' کشمیر میں بھارتی حکومت نے جس ریفرنڈم کا وعدہ کیا تھا اس کے ضامن کی حیثیت سے ایک ذمہ داری رکھتی ہے۔ کشمیر کے معاملے میں پرامن حل کی واحد امید اقوام متحدہ ہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خود فونت لائن کا مقالہ نگار وی آر راگھاون اپنے تجزیے کو اس نتیجے پر ختم کرتا ہے: کارگل نے بھارت اور پاکستان کو فیصلے کے لمحے تک پہنچا دیا ہے۔ یہ موقع ہے کہ کارگل سے آگے دونوں ممالک کی بھلائی کے لیے' مسئلہ کشمیر کے طویل المیعاد سلامتی کے مضمرات کو دیکھا جائے (۱۸ جون' ۱۹۹۹' ص ۷۸)۔

اسی نوعیت کے خیالات کا اظہار دی اکانومسٹ' واشنگٹن پوسٹ' الاہرام اور دوسرے عالمی اخبارات اور رسائل میں ہوا لیکن اس کا کوئی فائدہ پاکستان کے سفارتی حلقوں نے نہیں اٹھایا۔ حالانکہ یہ ایسا موقع تھا کہ بھارت کو corner کیا جا سکتا تھا اور اس کے پروپیگنڈے کے غبارے سے ہوا نکالی جا سکتی تھی۔

دوسرے نکتے کے بارے میں ہم اوپر گفتگو کر چکے ہیں کہ اصل جدوجہد کشمیری عوام کی ہے اور پاکستان کوئی غیر نہیں' مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں ایک پارٹی کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کی جدوجہد آزادی' ان کا حق ہے اور پاکستان' امت مسلمہ اور دنیا کے تمام سامراج مخالف انسانوں کا فرض ہے کہ اس جدوجہد آزادی میں اہل کشمیر کی مدد کریں۔ ظالم اور غاصب قوت بھارت ہے' مجاہدین نہیں۔

تیسرے نکتے کا تعلق کنٹرول لائن سے ہے۔ لیکن یہاں بھی سارے حقائق بھارت کے خلاف جاتے ہیں۔ یہ بات کہ کنٹرول لائن کاغذ پر تو ایک خاص مقام تک (NJ 9842) طے ہوئی تھی' درست ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بہت سے مقامات پر خصوصیت سے کارگل سیکٹر میں زمین پر اس کی حد بندی کبھی نہیں ہوئی۔ فرنٹ لائن کے تازہ شمارے میں (۱۸ جون ۹۹) ایک مقالہ نگار پرافل بدوائی "Playing with Fire in Kargil" کے عنوان سے اپنے مضمون میں اعتراف کرتا ہے: اس حقیقت کی موجودگی میں کہ کشمیر میں کنٹرول لائن کی زمین پر حد بندی نہیں ہے اور اس ابہام کی وجہ سے فضائی حدود کی خلاف ورزی کے لیے بڑی گنجایش ہے' ہوائی حملے' جوابی کارروائی اور مزید جوابی کارروائی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

جہاں تک کارگل کا تعلق ہے اس میں اللہ تعالیٰ کے قانون مکافات کا عمل صاف نظر آتا ہے۔ کارگل کا یہ پورا علاقہ پاکستان کے پاس تھا جس پر ۱۹۶۵ کی جنگ میں بھارت نے قبضہ کر لیا تھا مگر معاہدہ تاشقند کے بعد اسے دوبارہ پاکستان کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ جب بھارت نے ۱۹۷۱ کی جنگ میں اس پر دوبارہ قبضہ کیا تو ۱۹۷۲ کے شملہ معاہدے کے تحت جو پاکستان نے مجبوری کے عالم میں (under duress) کیا تھا' اسے محض طاقت کے زور پر واپس نہیں کیا گیا بلکہ سیز فائر لائن کا نام بدل کر لائن آف کنٹرول کر دیا گیا۔ پھر ۱۹۸۴ میں بھارت نے اس کنٹرول لائن کی بھی خلاف ورزی کی اور سیاچین کے گلیشیر پر موقع پاتے ہی قبضہ کر لیا۔ ۱۹۹۹ میں بالکل اسی طرح جس طرح سیاچین کے ایک حصہ پر بھارت نے قبضہ کیا تھا' مجاہدین کشمیر نے کارگل کی اہم ترین چوکیوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا جس پر بھارت آتش زیرپا ہے اور بے دردی سے زمینی اور فضائی فوجی کارروائی کر رہا ہے۔ خطرہ ہے کہ جو نقصانات اسے اٹھانا پڑ رہے ہیں ان سے مشتعل ہو کر لائن آف کنٹرول پار کرنے اور پاکستان کے خلاف دوسرے محاذ کھولنے کی حماقت نہ کر گزرے۔ بھارت نے سیاچین

میں دخل اندازی کے علاوہ بھی کئی سو مرتبہ لائن آف کنٹرول کی خلاف ورزیاں کی ہیں جن کا پورا ریکارڈ پاکستان اور اقوام متحدہ کے مبصرین کے پاس ہے۔

بھارت نے کنٹرول لائن پر اقوام متحدہ کے نمایندوں کی نگرانی اور اقوام متحدہ کی امن فوج لگانے کی ہمیشہ مخالفت کی ہے جو اس کی بدنیتی کا کھلا ثبوت ہے۔ کارگل کے بارے میں بھارت کا کیس نہایت بودا اور تضادات کا مجموعہ ہے۔ لیکن یہاں بھی پاکستان عالمی رائے عامہ، حتیٰ کہ چین اور عرب ممالک تک کو جو ہمارے بہترین حلیف رہے ہیں اپنا ہم نوا بنانے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا ہے۔ چین اور پاکستان کا تو خالص سلامتی کے نقطۂ نظر سے بھی مفاد مشترک ہے لیکن ہماری سفارتی کارکردگی انتہائی غیر تسلی بخش ہے۔

کارگل میں مجاہدین نے اپنی بالادستی ثابت کر دی ہے۔ اب اولیں ترجیح اس بالادستی کو برقرار رکھنے کو ملنی چاہیے اور اس کے لیے تمام جہادی قوتوں کو مکمل اتفاق اور یک جہتی کے ساتھ اس محاذ پر مضبوطی سے ڈٹے رہنا چاہیے۔ نیز حکومت پاکستان، پاکستانی قوم اور پاکستانی افواج کو اپنے اپنے دائرے میں اپنی ذمہ داری ادا کرنی چاہیے۔

لیکن اس وقت اصل خطرہ نیم جنگ کی موجودہ کیفیت کے ایک وسیع تر جنگ میں بدل جانے کا ہے۔ اس سلسلے میں عالمی سیاسی حلقوں میں مختلف نظریات پر گفتگو ہو رہی ہے۔ امریکہ اور اسرائیل کے کچھ حلقے بھارت کی مجبوری کا سہارا لے کر اسے جنگ کے جال میں پھنسانا چاہتے ہیں اور درپردہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ ان خطرات کا اظہار امریکہ کے مسلمان سائنس دانوں اور انجینیرز کی تنظیم نے کھل کر کیا ہے۔ پاکستانی فوج اور قیادت کو ان خدشات کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنی صلاحیت کی حفاظت اور مقابلے کے لیے پیش بندی دونوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اسی طرح روایتی جنگ کا امکان بھی بڑھ رہا ہے اور جس وقت یہ سطور تحریر کی جارہی ہیں اس وقت بھارت سے آنے والی تمام ہی اہم اطلاعات کا رخ کشمیر میں محدود جنگ اور پاکستان کے خلاف ایک بھرپور جنگ کی طرف ہے۔ بال ٹھاکرے نے تو پاکستان کو سبق سکھانے کا اعلان کر دیا ہے اور واجپائی اور جسونت سنگھ بھی کھلی جنگ کی باتیں کر رہے ہیں۔ فوجی اور سابق فوجی حلقوں میں بھی انھی خطوط پر اظہار رائے کیا جا رہا ہے، اس لیے جنگ کے ان خطرات کو محض وہم نہ سمجھا جائے اور سنجیدگی سے مقابلے کی تیاری کی جائے۔

جنرل میک آرتھر نے صحیح ہی کہا ہے کہ: دنیا کی تاریخ نے شروع ہی سے یہ سکھایا ہے کہ بزدلی سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور بہادری اکثر انھیں روک دیتی ہے۔ اس لیے یہ اصول اہل دانش و تجربہ نے بیان کیا ہے کہ جنگ کو روکنے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے جنگ کے لیے تیار رہنا۔ طاقت کے توازن

کے بغیر امن قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر دشمن کا مقابلہ کرنے کی طاقت ہو تو امن قائم رہ سکتا ہے اور آزادی اور عزت محفوظ رہ سکتے ہیں ورنہ ع

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

قرآن نے بھی امت مسلمہ کو مقابلے کے لیے تیار رہنے کی حکمت عملی کی تعلیم دی ہے۔ وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ج لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ج اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ط وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (الانفال ۸: ۶۰) اور تم لوگ، جہاں تک تمھارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعدا کو خوف زدہ کر دو جنھیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمھاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمھارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہو گا۔

اس وقت ملک جن خطرات کی زد میں ہے، ان کا مقابلہ صرف فوجی تیاری سے نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ فوج کا چوکس اور تیار رہنا اولیں ضرورت ہے لیکن سیاسی قیادت کا صحیح رویہ، بالغ نظری، جرأت اور استقامت بھی اتنے ہی ضروری ہیں۔ قوم کو کسی بڑے معرکہ کے لیے تیار کرنا اور تیار رکھنا بھی اس کا ویسا ہی اہم حصہ ہے۔ قوم میں یکسوئی اور اپنی آزادی، عزت اور سلامتی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کا جذبہ اور شوق، ایمان کے بعد طاقت کا سب سے بڑا منبع ہے۔ اسی طرح معیشت کی مضبوطی بھی ازبس ضروری ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ عسکری صلاحیت بھی معاشی وسائل کی فراہمی کے بغیر غیر موثر ہو جاتی ہے۔ ان سب سے بڑھ کر اللہ پر ایمان اور بھروسہ اور اس کی اعانت اور نصرت کی طلب۔ یہ پانچ عناصر، جنگ ہو یا امن، دونوں میں ترقی اور استحکام کے ضامن ہیں۔ جہاں ہمیں اپنی فوج کے جذبے اور صلاحیت کے بارے میں پورا اطمینان ہے، وہیں باقی عناصر کی ضرورت کے مطابق موجود اور موثر ہونے کے بارے میں اطمینان کا اظہار مشکل ہے۔ البتہ ان میں سے ہر ایک عنصر کی فراہمی اور استحکام کی فکر وقت کی ضرورت ہے۔

یہ پہلو بھی سامنے رہنا چاہیے کہ جہاں اس وقت ایک تاریخی موقع ہمیں حاصل ہے وہیں قیادت کی ذمہ داری ہے کہ پورے اخلاص، دیانت اور بالغ نظری کے اپنے حالات، وسائل اور پیش آمدہ چیلنج اور اس کے تقاضوں کا ادراک کرے اور نہ بزدلی اور فرار کا راستہ اختیار کرے اور نہ ایسے خطرات مول لے جن کے مقابلے کے لیے تیاری نہ ہو۔ ہماری لڑائی طویل ہے اور اس میں ہر لمحہ قیمتی ہے۔ کسی موقع کو کھو دینا بھی جرم ہے اور استعداد کو نظرانداز کر کے معاملات کرنا بھی حکمت و دانش کے خلاف ہے۔ جہاں توکل کا

حکم ہے' وہیں اونٹ باندھنے کو بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود اس قوم میں بڑی صلاحیت اور خیر ہے لیکن اس صلاحیت اور خیر کی صحیح نظم بندی بھی ضروری ہے۔ خطرات مول لیے بغیر کوئی بڑا کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن خطرات مول لینے اور جوا کھیلنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ سوچ سمجھ کر خطرات کا مقابلہ کرنا اصل مردانگی اور شجاعت ہے۔ اور اس نازک لمحے میں ایمان کے ساتھ ساتھ حکمت اور شجاعت ہمارے اصل ہتھیار ہیں۔

قوم اور ملک کو درپیش خطرات کے لیے تیار کرنے اور قوم میں یکسوئی اور یک جہتی پیدا کرنے کی اصل ذمہ داری سیاسی قیادت پر ہے جسے اپنے خول سے نکل کر وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ پارلیمنٹ اور پارلیمنٹ کے باہر تمام قومی اور ملی عناصر کو ساتھ لے کر چلنے کی فکر کرنی چاہیے۔ لائن آف کنٹرول کے احترام' یا محض کشمیر میں محدود کشمکش کے مفروضوں کا محصور ہو جانا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ تمام امکانات اور خطرات مختلف تناظر میں سامنے رکھنے ہوں گے اور ہر ایک کے لیے مناسب حکمت عملی وضع کرنا ہوگی۔ اس کے لیے قوم کو اعتماد میں لینا اور قوم کی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ضروری ہے۔ اندرونی تیاری کے ساتھ ساتھ دوستوں کو اعتماد میں لینا اور ان کے تعاون سے عالمی رائے عامہ اور کارفرما قوتوں کو متاثر کرنا بھی وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ پاکستان کے قریب ترین دوستوں میں بھی آج وہ گرم جوشی نہیں جو پہلے تھی۔ اس طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ بھرپور دنیا میں موثر سفارتی مہم کا منصوبہ بنانا چاہیے اور جو وزن (leverage) ہمیں ایک ایٹمی طاقت کے طور پر حاصل ہوگیا ہے اسے حکمت اور دانائی کے ساتھ استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ پروپیگنڈے کے میدان میں بھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ افراد کی قد و قامت بڑھانے کے بجائے ایشوز اور مسائل و حالات پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ عالمی میڈیا سے روابط بڑھانے اور خصوصیت سے کشمیر کے مسئلے پر ان کا تعاون حاصل کرنے کو فوری اہمیت دینا چاہیے۔ چین' ایران' سعودی عرب' خلیج کے ممالک' ترکی اور وسط ایشیا کے ممالک کے لیے خصوصی سفارتی مہمات کا اہتمام ہونا چاہیے۔ وزیراعظم کو خود متحرک ہونا چاہیے لیکن ان کے ساتھ سیاحتی طائفوں کی جگہ باصلاحیت ماہرین کی مختصر ٹیم ہونا چاہیے۔ نیز قوم کے اہل ترین افراد کو اہم سفارتی مہمات پر بھیجنے کی ضرورت ہے۔ اس میں مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کے اصحاب فکر و نظر کو شریک کیا جائے اور سب مل جل کر ایک ٹیم کی طرح کام کریں تاکہ ملک و ملت کو جو ایمرجنسی درپیش ہے اس کا موثر مقابلہ ہو سکے۔

اس کے ساتھ ہی ہم اس طرف توجہ دلانا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ قومی زندگی کے اس مرحلے پر جب

کہ دشمن کی جنگی تیاریاں بڑھتی جا رہی ہیں' ہمیں اپنے اصل اور حقیقی مددگار' اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو پکارنا چاہیے۔ کیا حکمراں اور کیا عوام' سب کو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور اس سے نصرت اور کامیابی کی دعائیں کرنا چاہیے۔ کامیابی میں یقیناً تدبیر اور حکمت عملی کا دخل ہوتا ہے لیکن تدبیر اور حکمت عملی سجھانے والی ذات بھی اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کی ہے۔ اسی سے عرض کرنا چاہیے' اسی سے مانگنا چاہیے۔ کوئی بھی معرکہ اس کی نصرت کے بغیر سر نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن بتاتا ہے' اور تاریخ شاہد ہے کہ کتنے ہی کم تعداد اور بظاہر کمزور گروہ اپنے سے زیادہ اور بظاہر طاقت ور گروہوں پر غالب آ جاتے ہیں۔ قرآن واضح کرتا ہے کہ اہل ایمان کے ایمان کی کیفیت سے اس تناسب کا براہ راست تعلق ہے۔

اس لیے اہل پاکستان کو اس مرحلے پر اصل فکر اپنے ایمان کی کرنا چاہیے۔ ایمان گھٹنے بڑھنے والی چیز ہے۔ لاپرواہی سے ضائع بھی ہو جاتی ہے۔ دلوں میں ایمان مضبوط ہو تو اعمال صالحہ کی فصل لہلہاتی نظر آتی ہے۔ اعمال ہی ایمان کا پیمانہ ہیں۔ کسی بھی شخص سے' اس کے ایمان کی کیفیت کوئی راز نہیں ہوتی لیکن اجتماعی زندگی کے اطوار بھی' من حیث القوم' اسے آشکار کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے ہوئے' اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے' ہمیں ہر سطح پر یہ جائزہ بھی لینا چاہیے کہ ہمارے کون سے کام اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے والے اور کون سے کام اسے ناراض کرنے والے ہیں۔ اگر صرف ذرائع ابلاغ کو دیکھا جائے' جسے معاشرے کا عکس بھی کہا جا سکتا ہے' اور معاشرے کو کسی قالب میں ڈھالنے کی کوشش بھی' تو سنگین صورت حال سامنے آتی ہے۔ ہم ارباب حکومت سے اور ہر دائرے میں معاشرے کے قائدین اور ہر عام و خاص سے گذارش کریں گے کہ اگر وہ کشمیر کے جہاد میں شہادت کی آرزو لے کر جانیں نچھاور کرنے والے مجاہدین سے کچھ بھی اخلاص رکھتے ہیں' تو اس موقع پر ان اعمال کو ترک کرنے کا عہد کریں جو اللہ تعالیٰ کے احکامات کی کھلی نافرمانی اور اس کے غضب کو دعوت دینے والے ہیں۔ ہم سب سچے دل سے توبہ کریں اور استغفار کو اپنا شعار بنائیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت بے پایاں ہے' ہم اس کی طرف پلٹیں تو اس کا وعدہ ہے کہ وہ ہماری طرف آئے گا۔ قومی سطح پر توبہ و استغفار کی روش ہی ہماری کامیابی اور نصرت الٰہی کی اصل ضمانت ہے۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا سکتہ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ (الاعراف ۷: ۲۳) اے ہمارے رب' ہم نے اپنے اوپر بڑا ظلم کیا' اگر تو ہماری مغفرت نہ فرمائے اور ہم پر رحم نہ کھائے تو ہم یقیناً تباہ ہو جائیں گے۔

ایمان کا اصل امتحان
معاملات میں ہے!
معاملات کا دائرہ
پوری زندگی پر،
اس کے ہر گوشے پر
محیط ہے

نماز روزہ کا التزام
نوافل و عبادات کا اہتمام
درس قرآن اور نیکی کی تلقین
یقیناً نیکیاں ہیں ------- لیکن

اگر
حقوق غصب کیے ہوئے ہیں
بہنوں کو وراثت نہیں دی ہے
زمینوں پر ناجائز قبضے کیے ہیں
لوگوں کا مال دبا رکھا ہے
غیبت میں تکلف نہیں ہے
زیردستوں سے بدسلوکی کرتے ہیں

تو یہ نیکیاں ---
منہ پر ماری جا سکتی ہیں
اور ان کے کام آئیں گی جن کے حقوق غصب کیے ہوں گے
اس لیے ------ فکر کر لیں
اس سے پہلے کہ مہلت عمل نہ رہے!

(خیر خواہ)

تلاش حقیقت

فلسفیانہ تجسّس، جس کا مقصد یہ پتا چلانا ہے کہ اس کائنات میں بظاہر جو کچھ ہم دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اس کے پیچھے کوئی حقیقت پوشیدہ ہے یا نہیں اور ہے تو وہ کیا ہے، دنیا میں ان سب لوگوں کے لیے جو وحی و الہام سے براہ راست حقیقت کا علم نہیں پاتے، مذہب کے متعلق رائے قائم کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ کوئی شخص بھی، خواہ دہریت اختیار کرے یا شرک یا خدا پرستی، بہرحال ایک نہ ایک طرح کا فلسفیانہ تجسّس کیے بغیر مذہب کے بارے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ اور پیغمبروں نے جو مذہب پیش کیا ہے اس کی جانچ بھی اگر ہو سکتی ہے تو اسی طرح ہو سکتی ہے کہ آدمی، اپنی بساط بھر، فلسفیانہ غور و فکر کر کے اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کرے کہ پیغمبر ہمیں مظاہر کائنات کے پیچھے جس حقیقت کے مستور ہونے کا پتا دے رہے ہیں، وہ دل کو لگتی ہے یا نہیں۔ اس تجسّس کے صحیح یا غلط ہونے کا تمام تر انحصار طریق تجسّس پر ہے۔ اس کے غلط ہونے سے غلط رائے اور صحیح ہونے سے صحیح رائے قائم ہوتی ہے۔ اب ذرا جائزہ لے کر دیکھیے کہ دنیا میں مختلف گروہوں نے اس تجسّس کے لیے کون کون سے طریقے اختیار کیے ہیں:

مشرکین نے خالص وہم پر اپنی تلاش کی بنیاد رکھی ہے۔

اشراقیوں اور جوگیوں نے اگرچہ مراقبہ کا ڈھونگ رچایا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ ہم ظاہر کے پیچھے جھانک کر باطن کا مشاہدہ کر لیتے ہیں، لیکن فی الواقع انھوں نے اپنی سراغ رسانی کی بنا گمان پر رکھی ہے۔ وہ مراقبہ دراصل اپنے گمان کا کرتے ہیں، اور جو کچھ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں نظر آتا ہے، اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ گمان سے جو خیال انھوں نے قائم کر لیا ہے اسی پر تخیل کو جما دینے اور پھر اس پر ذہن کا دباؤ ڈالنے سے ان کو وہی خیال چلتا پھرتا نظر آنے لگتا ہے۔

اصطلاحی فلسفیوں نے قیاس کو بنائے تحقیق بنایا ہے جو اصل میں تو گمان ہی ہے لیکن اس گمان کے لنگڑے پن کو محسوس کر کے انھوں نے منطقی استدلال اور مصنوعی تعقل کی بیساکھیوں پر اسے چلانے کی کوشش کی ہے اور اس کا نام "قیاس" رکھ دیا ہے۔

سائنس دانوں نے اگرچہ سائنس کے دائرے میں تحقیقات کے لیے علمی طریقہ اختیار کیا، مگر مابعد الطبیعیات کے حدود میں قدم رکھتے ہی وہ بھی علمی طریقے کو چھوڑ کر قیاس و گمان اور اندازے اور تخمینے کے پیچھے چل پڑے۔

پھر ان سب گروہوں کے اوہام اور گمانوں کو کسی نہ کسی طرح تعصب کی بیماری بھی لگ گئی جس نے انھیں دوسرے کی بات نہ سننے اور اپنی ہی محبوب راہ پر مڑنے اور مڑ جانے کے بعد مڑے رہنے پر مجبور کر

دیا۔

قرآن اس طریق تجسس کو بنیادی طور پر غلط قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم لوگوں کی گمراہی کا اصل سبب یہی ہے کہ تم تلاش حقیقت کی بنا گمان اور قیاس آرائی پر رکھتے ہو اور پھر تعصب کی وجہ سے کسی کی معقول بات سننے کے لیے بھی آمادہ نہیں ہوتے۔ اسی دہری غلطی کا نتیجہ یہ ہے کہ تمھارے لیے خود حقیقت کو پالینا تو ناممکن تھا ہی' انبیا کے پیش کردہ دین کو جانچ کر صحیح رائے پر پہنچنا بھی غیر ممکن ہو گیا۔

اس کے مقابلے میں قرآن فلسفیانہ تحقیق کے لیے صحیح علمی و عقلی طریقہ یہ بتاتا ہے کہ پہلے تم حقیقت کے متعلق ان لوگوں کا بیان کھلے کانوں سے' بلاتعصب سنو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم قیاس و گمان یا مراقبہ و استدراج کی بنا پر نہیں بلکہ "علم" کی بنا پر تمھیں بتا رہے ہیں کہ حقیقت یہ ہے۔ پھر کائنات میں جو آثار (باصطلاح قرآن "نشانات") تمھارے مشاہدے اور تجربے میں آتے ہیں ان پر غور کرو' ان کی شہادتوں کو مرتب کر کے دیکھو' اور تلاش کرتے چلے جاؤ کہ اس ظاہر کے پیچھے جس حقیقت کی نشان دہی یہ لوگ کر رہے ہیں اس کی طرف اشارہ کرنے والی علامات تم کو اسی ظاہر میں ملتی ہیں یا نہیں۔ اگر ایسی علامات نظر آئیں اور ان کے اشارے بھی واضح ہوں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم خواہ مخواہ ان لوگوں کو جھٹلاؤ جن کا بیان آثار کی شہادتوں کے مطابق پایا جا رہا ہے--- یہی طریقہ فلسفہ اسلام کی بنیاد ہے جسے چھوڑ کر افسوس ہے کہ مسلمان فلاسفہ بھی افلاطون و ارسطو کے نقش قدم پر چل پڑے۔

قرآن میں جگہ جگہ نہ صرف اس طریق کی تلقین کی گئی ہے' بلکہ خود آثار کائنات کو پیش کر کے ان سے نتیجہ نکالنے اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی گویا باقاعدہ تربیت دی گئی ہے تاکہ سوچنے اور تلاش کرنے کا یہ ڈھنگ ذہنوں میں راسخ ہو جائے۔ چنانچہ --- [یہاں] مثال کے طور پر صرف دو آثار کی طرف توجہ دلائی گئی ہے' یعنی رات اور دن۔ یہ انقلاب لیل و نہار دراصل سورج اور زمین کی نسبتوں میں انتہائی باضابطہ تغیر کی وجہ سے رونما ہوتا ہے۔ یہ ایک عالم گیر ناظم اور ساری کائنات پر غالب اقتدار رکھنے والے حاکم کے وجود کی صریح علامت ہے۔ اس میں صریح حکمت اور مقصدیت بھی نظر آتی ہے کیونکہ تمام موجودات زمین کی بے شمار مصلحتیں اسی گردش لیل و نہار کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس میں صریح ربوبیت اور رحمت اور پروردگاری کی علامتیں بھی پائی جاتی ہیں کیونکہ اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ جس نے زمین پر یہ موجودات پیدا کی ہیں وہ خود ہی ان کے وجود کی ضروریات بھی فراہم کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالم گیر ناظم ایک ہے' اور یہ بھی کہ وہ کھلنڈرا نہیں بلکہ حکیم ہے اور بامقصد کام کرتا ہے' اور یہ بھی کہ وہی محسن و مربی ہونے کی حیثیت سے عبادت کا مستحق ہے' اور یہ بھی کہ گردش لیل و نہار کے تحت جو کوئی بھی ہے وہ رب نہیں مربوب ہے' آقا نہیں غلام ہے۔ ان آثاری شہادتوں کے مقابلے میں مشرکین نے گمان و قیاس سے جو مذہب ایجاد کیے ہیں' وہ آخر کس طرح صحیح ہو سکتے ہیں (تفہیم القرآن' ج ۲' ص ۲۹۶-۲۹۸)۔

قرآن- تمثیلات نبویؐ میں

محمد اسلام عمری ○

بہت سی ایسی احادیث ہیں جن میں قرآن مجید کی اہمیت' فضیلت اور اس پر غور و فکر کو تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں چند احادیث پیش کی جا رہی ہیں:

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: صاحب قرآن کی مثال اس بندھے ہوئے اونٹ کی طرح ہے۔ اگر اس کی نگرانی کی جائے تو جائے قرار پر رکا رہتا ہے اور اگر چھوڑ دیا جائے تو بھاگ جاتا ہے (مسلم 'کتاب فضائل القرآن' باب الامر بتعھد القرآن)۔

تجربہ بتاتا ہے کہ قرآن مجید جس قدر آسان ہے اسی طرح بآسانی یاد بھی ہو جاتا ہے لیکن بہت جلد سینوں سے نکل بھی جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مثال سے یوں سمجھایا ہے کہ جس طرح ایک اونٹ کو رسی سے کسی جگہ باندھ دیا جائے جب تک اس کی رسی مضبوط رہتی ہے تو اونٹ اس جگہ رکا رہتا ہے لیکن جیسے ہی اس کی رسی ٹوٹی یا ڈھیلی ہوئی اونٹ بھاگ جائے گا۔ ایسے ہی اگر دلوں میں قرآن مجید کی حفاظت نہ کی گئی تو اس کا بھی یہی حال ہو گا۔ اس کی طرف سے معمولی بے رغبتی اس کے بھول جانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ قرآن مجید کی فراموشی پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ مومن کو اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے اور یاد رکھنے کی فکر کرنا چاہیے۔

امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو حفاظت قرآن پر ابھار رہے ہیں اور اس کے نسیان کے برے انجام سے آگاہ کر رہے ہیں (نووی' شرح مسلم' ج ۱' ص ۲۶۷)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس حدیث میں حفاظت قرآن کی طرف کتنی اچھی مثال کے ذریعے توجہ دلائی ہے۔ اس میں رغبت بھی ہے اور قرآن مجید کے تعلق سے بیداری بھی۔

○ ریسرچ اسکالر' ادارہ تحقیق و تصنیف' علی گڑھ' بھارت

قرآن مجید سے تعلق کی استواری ایمان و نفاق کی کسوٹی ہے۔ جس کا ایمان جس قدر پختہ ہو گا اس کے بقدر قرآن مجید سے اس کا رشتہ مضبوط ہو گا اور جو نفاق سے قریب ہو گا وہ قرآن مجید سے دور ہو گا۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو مومن قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال چکوترا کی سی ہے جس کا مزہ بھی اچھا ہے اور خوشبو بھی۔ اور جو مومن قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثال کھجور کی سی ہے جس میں خوشبو تو نہیں لیکن اس کا مزہ شیریں ہے۔ اور جو منافق قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثال حنظل جیسی ہے جس میں کوئی خوشبو ہی نہیں اور مزہ بھی کڑوا ہے (ترمذی، ابواب الامثال، باب ماجاء مثل المومن القاری للقرآن)۔

محدث عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ نے اس حدیث کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ مومن اس پر غور کرے اور اس غور و فکر کے نتیجے میں جو بات اس کے ذہن میں آئے اس کے مطابق عمل کرے تو کماحقہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے ورنہ قرآن مجید کے استفادے سے وہ محروم ہی رہے گا (تحفۃ الاحوذی، ج ۴، ص ۳۸)۔

اس خوب صورت مثال میں قرآن پڑھنے اور نہ پڑھنے والے مومن اور منافق کی کیفیت کو واضح کیا گیا ہے۔ قرآن پڑھنے کا خوشبو سے اور ایمان و نفاق کا مزے سے تعلق بیان کیا گیا ہے۔ مومن قرآن پڑھے تو مزہ بھی اچھا، خوشبو بھی اچھی۔ اور منافق نہ پڑھے تو مزہ بھی کڑوا اور خوشبو بھی غائب۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان سے مالا مال کرے اور قرآن سے ایسا تعلق رکھے کہ ہم اس کی تلاوت کریں اور اس پر غور و فکر کریں اور اپنی زندگی اس کے مطابق ڈھالیں۔

O

حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلند آواز سے تلاوت کرنے والا ایسا ہے جیسے کہ علی الاعلان صدقہ کرنے والا اور آہستہ قرآن پڑھنے والا خاموشی کے ساتھ صدقہ کرنے والے کے مثل ہے (ترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب بغیر عنوان)۔

مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی فہم کا اظہار کرنے والا علی الاعلان صدقہ کرنے والے کی طرح ہے کہ علی الاعلان صدقہ کرنے سے دوسروں کو بھی اس کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ نیز دوسروں کے اندر بھی انفاق کا جذبہ ابھرتا ہے۔ چنانچہ وہ بھی خلق خدا کے ساتھ تعاون و ہمدردی کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ اسی طرح فہم قرآن کا اظہار کرنے سے دوسرے بندوں کے اندر بھی فہم قرآن کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے، وہ یہ سوچنے پر

مجبور ہو جائیں کہ قرآن مجید انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے تو اس سے رہنمائی کیوں نہ حاصل کی جائے۔

اس حدیث کا مفہوم یہ بھی ہے کہ خاموشی کے ساتھ صدقہ دینا اس اعتبار سے افضل ترین عبادت ہے کہ اس سے انفاق کرنے والے کے دل میں ریا و نمود کا کوئی شائبہ نہیں آتا۔ ایسا صدقہ سراپا خلوص ہوتا ہے۔ لینے والے کے دل میں بھی کسی طرح کی کوئی خفت و شرمندگی نہیں ہوتی۔ اسی طرح خاموشی کے ساتھ قرآن مجید پڑھنے والا یا اس پر غور و فکر کرنے والا اپنے کام میں مخلص ہوتا ہے' اس کے اندر فہم قرآن کا غلط کبر و غرور پیدا نہیں ہونے پاتا۔ وہ نہایت خاموشی کے ساتھ کتاب اللہ سے تعلق قائم کر کے اپنے رب سے اپنا رشتہ استوار کر لیتا ہے۔ اس طرح قرآن مجید پڑھنے والا اور صدقہ کرنے والا دونوں حالتوں میں اجر سے نوازا جاتا ہے۔

ترمذی کے اردو مترجم علامہ بدیع الزماںؒ نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: "مراد حدیث کی یہ ہے کہ آہستہ قرآن پڑھنا افضل ہے پکار کر پڑھنے سے۔ اس لیے کہ اہل علم کے نزدیک چھپا کر صدقہ دینا افضل ہے آشکارا سے۔ اہل علم نے اس کو اس لیے افضل کہا ہے کہ چھپا کر صدقہ کرنے میں آدمی عجب سے بچتا ہے۔ اس لیے کہ چھپا کر نیکی کرنے والا محفوظ رہتا ہے اور خوف نہیں ہوتا اس پر عجب کا جیسا کہ خوف ہوتا ہے علانیہ پر (ترمذی ' مترجم ج ۲' ص ۳۴۹)۔

حدیث کے اس پہلو کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ حالات اور وقت کی مناسبت سے کبھی صدقہ علی الاعلان دینا موزوں ہوتا ہے تو کبھی نہایت خاموشی کے ساتھ دینا مفید۔ اسی طرح قرآن مجید کبھی باآواز بلند پڑھنا بہتر ہوتا ہے تو کبھی خاموشی کے ساتھ۔

قرآن مجید کی تعلیمات سے دل کو خالی نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ایسا ہو جائے تو ایمان کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔

O

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس کے دل میں ذرہ برابر بھی قرآن نہیں وہ ویران گھر کی مانند ہے۔ (ترمذی ' ابواب فضائل القرآن' باب ماجاء فی من قرا حرفا من القرآن ماله من اجر)

قرآن دل میں ہونے کی کیفیت کو ہر مسلمان محسوس کر سکتا ہے۔ محض حفظ مراد نہیں ہے بلکہ استحضار ہو۔ عام معاملات زندگی میں دل جو رہنمائی دے وہ قرآن سے ماخوذ ہو۔ جہاں سے رہنمائی نہ ملے' اس کے ویران گھر ہونے میں کیا شبہ ہے؟ زندگی قرآن ہی سے ہے۔

O

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قرآن کی تعلیم حاصل کرو' اس کو پڑھو اور حفاظت کرو کیوں کہ جس نے قرآن کی تعلیم حاصل کی' اس کو پڑھا اور اس کے مطابق عمل کیا' اس کی مثال اس میان کی سی ہے جس میں مشک بھرا ہوا ہے' اس کی خوشبو ہر جگہ پھیلتی ہے۔ اور اس شخص کی مثال جس نے قرآن کی تعلیم حاصل کی لیکن اس سے غافل ہوگیا' قرآن اس کے ذہن ہی میں رہ گیا' اس کی مثال اس میان کی سی ہے جس کا منہ مشک کے اندر باندھ دیا گیا ہے (ابن ماجہ' باب فضل من تعلم القرآن وعلمہ)۔

قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے کی طرف رغبت دلانے کا یہ بھی ایک اسلوب ہے۔ قرآن کی تعلیم حاصل کر لینا کمال کی بات نہیں بلکہ اس کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے۔ قرآن مجید کے مطابق عمل کرنے سے نہ صرف مومن کی ذات کو فائدہ پہنچتا ہے بلکہ دوسرے بھی اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ خوشبو ہر ایک کو پہنچتی ہے۔ اس کے برخلاف قرآن مجید سے غافل رہنے والا انسان خسارے میں رہتا ہے۔

ان چند احادیث کے مطالعے سے مومن کی زندگی کے لیے قرآن سے تعلق کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو قرآن مجید کی تعلیم سے آراستہ ہونے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)۔

وقت ہی زندگی ہے!

امام حسن البنا شہیدؒ

ترجمہ: عارفہ اقبال

وقت سونے کی طرح قیمتی ہے!

یہ مادی اقدار کے لحاظ سے ان لوگوں کے لیے صحیح ہے جو وجود کو وقت کے پیمانے سے ناپتے ہیں' لیکن جو لوگ اس سے بھی آگے نظر ڈالتے ہیں ان کے لیے وقت ہی زندگی ہے۔

کیا اس عالم وجود میں انسان کی زندگی اس وقت کے علاوہ کچھ اور ہے جو وہ پیدایش سے وفات تک گزارتا ہے؟ آپ سونے کو کھو سکتے ہیں لیکن وہ پھر سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور گم شدہ سونے سے کئی گنا زیادہ آپ دوبارہ پا لیتے ہیں۔ لیکن گئے وقت اور گزرے ہوئے زمانے کو آپ لوٹا نہیں سکتے۔

لہٰذا وقت سونے سے زیادہ قیمتی ہے' الماس سے زیادہ گراں قدر ہے۔ ہر جوہر و عرض سے برتر ہے اس لیے کہ وہ خود زندگی ہے۔ کامیابی کا راز کسی دقیق نکتے میں پوشیدہ نہیں ہے بلکہ وہ مناسب لمحے پر موقوف ہے۔ جلدی یا دیر' دونوں سے ڈرا جاتا ہے اور اصل اہمیت اس کی ہے کہ کام اپنے مناسب وقت پر ہو۔

وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ (المزمل ۷۳: ۲۰) اللہ ہی رات اور دن کے اوقات کا حساب رکھتا ہے----- اور اس لیے سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے اور خالی ہاتھ رہ جانے والے یہ غافل لوگ ہیں۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ز لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ز وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ز وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ط اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ o (الاعراف ۷: ۱۷۹) اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے

بھی زیادہ گئے گزرے' یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعاؤں میں سے ایک یہ بھی تھی:

اَللّٰھُمَّ لاَ تَدَعْنَا فِیْ غَمْرَۃٍ' وَلاَ تَأْخُذْنَا عَلٰی غِرَّۃٍ وَلاَ تَجْعَلْنَا مِنَ الْغٰفِلِیْنَ ۔

اے اللہ! ہم کو اندھیرے میں نہ رکھ' لاعلمی میں ہماری پکڑ نہ کر اور ہمیں غافلین میں نہ شامل کر۔

حضرت عمرؓ دعا کیا کرتے تھے کہ اللہ ان کے اوقات میں برکت اور لمحات میں خیر عطا کرے۔

قیامت کے دن کوئی بندہ اس پوچھ گچھ کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکے گا کہ اپنی عمر کن کاموں میں ختم کی' مال کس طرح کمایا اور کس طرح خرچ کیا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقت کی قدر و قیمت کا بہترین نقشہ اس حدیث میں پیش کیا ہے: "ہر روز فجر طلوع ہو کر پکارتی ہے کہ اے ابن آدم! میں نئی خلقت ہوں اور تیرے اعمال پر گواہ ہوں' تو میرے ذریعے زاد راہ تیار کر لے کیونکہ پھر میں قیامت کے دن تک نہیں پلٹوں گی"۔

اس عالم وجود میں کوئی چیز وقت سے زیادہ قیمتی نہیں اگرچہ اوقات برکت' سعادت اور خوش بختی کے لحاظ سے متفاوت ہیں۔ ایک لحہ دوسرے لمحے سے بڑھ کر مبارک ہوتا ہے اور اللہ کے نزدیک کوئی دن یا کوئی مہینہ' دوسرے دن یا دوسرے مہینے پر فضیلت رکھتا ہے۔

ھُوَ الْجَدُّ حَتّٰی تَفْضُلَ الْعَیْنُ اُخْتَھَا حَتّٰی یَکُوْنَ الْیَوْمُ لِلْیَوْمِ سَیِّدًا

یہ قسمت کی بات ہے کہ ایک آنکھ دوسری آنکھ سے برتر ہو جائے اور ایک دن دوسرے دن کا سردار ہو۔

اور یہ فرصت اللہ تعالی نے ہم مومنین کو عطا کی ہے کہ ہم غفلت کے بھوت کو بھگا کر بیداری اور تذکرے کی طرف مائل ہو جائیں اور جس وقت قبولیت کی ہوا کے جھونکے چلیں ہم بھی لطف و کرم سے فیض یاب ہوں۔

ان مبارک گھڑیوں میں نیکی کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ صالح بندوں کے درجات بلند کیے جاتے ہیں اور توبہ کا دروازہ چوپٹ کھول دیا جاتا ہے تاکہ اللہ جس شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرے وہ اس میں داخل ہو جائے۔ دن' ہفتہ اور مہینہ کی ان مبارک گھڑیوں کی طرف قرآن کریم کی آیات نے اشارہ کیا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توضیحات ان کی تاکید کرتی ہیں۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

فَسُبْحٰنَ اللّٰہِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ٥ وَلَہُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْھِرُوْنَ ٥ (الروم ۳۰: ۱۷-۱۸) پس اللہ کے لیے پاکی ہے جب تم شام کرتے ہو اور جب تم صبح کرتے ہو۔ اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے پاکی ہے اور رات کے وقت اور جب تم دوپہر کرتے ہو۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِیْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ o (الاعراف ۷: ۲۰۵) تو عاجزی اور خاموشی سے اپنے دل میں اللہ کو یاد کر اور صبح اور شام کو اپنی آواز بلند کیے بغیر۔ اور غافلوں میں سے مت ہو۔

وَالْفَجْرِ o وَلَیَالٍ عَشْرٍ o (الفجر۸۹: ۱-۲) قسم ہے صبح کی' قسم ہے دس راتوں کی!

لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَیَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْۤ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ (الحج ۲۲: ۲۸) تا کہ وہ اپنے منافع کا مشاہدہ کرلیں اور متعینہ دنوں میں اللہ کے نام کا ذکر کریں۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِیْۤ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ط (البقرہ ۲: ۲۰۳) اور اللہ کو یاد کرو ان گنے ہوئے دنوں میں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی احادیث میں وقت کی قدر و قیمت اور اس سے فائدہ اٹھانے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ مومن دو پر خطر گھاٹیوں کے درمیان ہوتا ہے: ایک جلد باز جو گزر جاتا ہے اور نہیں جانتا کہ یہاں اللہ کی کیا کاری گری ہے اور سست رو جو ٹھیرا رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ اللہ نے کیا فیصلہ کر دیا ہے۔ بندے کو اپنے نفس کی خاطر اس دنیا میں' آخرت کے لیے' جوانی میں بڑھاپے کے لیے اور اس زندگی میں حیات بعد الموت کے لیے تیاری کرلینا چاہیے۔

عزیز بھائی' عزیز بہن!

تمھارے سامنے ہر روز ایک گھڑی صبح میں' ایک گھڑی شام میں' اور ایک گھڑی سحر میں آتی ہے۔ ان گھڑیوں میں تم اپنی پاکیزہ روح کے ساتھ آسمان کی طرف چڑھ سکتے ہو اور دین و دنیا کا خیر ہو سکتا ہے۔ تمھارے آگے جمعہ کا دن اور رات ہے۔ اس میں تم اپنے ہاتھ' اپنے دل اور اپنی روح کو اللہ کی رحمت کے بہتے سمندر سے سیراب کرسکتے ہو۔ تمھارے لیے طاعت کے لیے خاص موسم' عبادت کے مخصوص ایام اور قربت حاصل کرنے والی راتیں آتی ہیں جن کی طرف قرآن کریم اور رسولؐ عظیم نے توجہ دلائی ہے۔ تم ان گھڑیوں میں غافل رہنے کے بجائے ذکر کرنے والوں میں ہونے کی تمنا کرو' مست پڑے رہنے کی بجائے عمل میں مشغول ہونے کی خواہش کرو۔

وقت کو غنیمت جانو' وہ تلوار کی طرح ہے اور ٹال مٹول کو چھوڑ دو' اس سے زیادہ مضر کوئی چیز نہیں۔

وَكُنْ صَارِمًا كَالْوَقْتِ فَالْمَقْتُ فِیْ عَسَیْ وَخَلِّ لَعَلَّ فَهِیَ اَكْبَرُ عِلَّةٌ

اور تو وقت کی طرح فیصلہ کن ہو جا۔ "شاید" میں خرابی ہی خرابی ہے اور "لَعَلَّ" کو چھوڑ دے کہ وہ سب سے بڑی علت ہے۔

اللہ سے دعا کرو کہ ہمیں اور تمھیں عمل مقبول اور بابرکت وقت کی توفیق دے۔

اکیسویں صدی کے تقاضے

ہارون الرشید ٥

نواحِ آگرہ میں کنواہہ کی تاریخی جنگ سے پہلے تھکے ہارے ترک سپاہیوں کے اصرار پر جب محمد شریف منجم نے ظہیرالدین بابر کو جنگ سے بچ نکلنے کا مشورہ دینے کا ارادہ کیا تو اسے یقین تھا کہ اس کی رائے ہرگز مسترد نہ کی جائے گی۔ محض اس لیے نہیں کہ ازبک اور ترک سپاہی اپنے تاتاری پڑوسیوں کی طرح توہم پرست واقع ہوئے تھے اور ستارہ شناسوں کے مشوروں کو بڑی اہمیت دیتے تھے بلکہ اس لیے بھی کہ رانا سانگا کی دو لاکھ تازہ دم افواج کے مقابل بابر کے ساتھ صرف ۱۲ ہزار تھکے ماندے عساکر موجود تھے۔ وہ شمشیر بردار جنھیں کابل اور فرغانہ کے چمن زاروں اور ندیوں کی یاد نے نڈھال کر رکھا تھا۔

بابر اپنے جواں سال اور لاابالی فرزند ہمایوں کے ہاتھ خزانوں کا بڑا حصہ' بدخشاں بھیج چکا تھا تاکہ وہ ترک اقتدار کا سایہ ماوراء النہر تک دراز کرنے کی کوشش کرے۔ کچھ تیمور کی پیروی میں بانٹ چکا تھا کہ وسطی ایشیا کا ہر حکمران داد و دہش میں کبھی نہ کبھی تیمور بننے کی کوشش کرتا۔ ہیرے اور جواہر میں سے جو کچھ باقی بچ رہا' وہ لاڈلا شہزادہ بادشاہ کی اجازت کے بغیر ہی اڑا لے گیا۔ وہ باپ کی کمزوریوں سے واقف تھا کہ وہ اولاد سے بے تاب محبت کا شکار رہتا ہے اور روپے پیسے کے معاملے میں کبھی اصرار سے کام نہیں لے سکتا۔

ترک سپاہی اور سردار اس وقت حیران رہ گئے جب انھوں نے دیکھا کہ محمد شریف منجم سے مشورہ تو کیا بادشاہ نے اسے باریابی تک کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ "میں اس کی شکل تک دیکھنا نہیں چاہتا"' چگی داڑھی والے اس عجیب و غریب فاتح نے کہا' جو ۱۲ برس کی عمر میں بادشاہ بن گیا تھا' جو اپنی افواج کو اولاد کی طرح عزیز رکھتا تھا اور پچھلی ربع صدی سے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار تھا' حتیٰ کہ لوگ تیمور اور چنگیز خاں سے اس کا تقابل کرنے لگے تھے۔

---

٥ معروف صحافی' دانش ور

وہ سب کے سب حیران تھے کہ اس نے پسپائی کے بارے میں سوچنے تک سے انکار کر دیا تھا حالانکہ ہر بڑا عسکری دماغ اس امر کو ملحوظ رکھتا تھا۔ سپہ سالار کتنا ہی بے پناہ ہو اور اس کے سپاہی کیسے ہی بے مثال واقع ہوئے ہوں، آخر کار وہ گوشت پوست کے انسان ہی تو تھے۔ کیا یہ وہی سپہ سالار نہ تھا جسے پوستین پہننے والے شیبانی خان نے دو بار موسموں کی شدت والے شہر سمرقند سے مار بھگایا تھا لیکن اب وہ ایک عجیب عالم میں تھا اور مسلسل جنگی ہدایات جاری کر رہا تھا۔ آخر کیوں؟ انھوں نے سوچا: بالآخر اس پر وہ پاگل پن سوار ہو گیا ہے، جو بے شمار کامیابیوں کے بعد ایک آخری اور تباہ کر دینے والی ناکامی لے کر آتا ہے۔

وہ بے خبر تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ظہیرالدین بابر کا ہمیشہ تجربات میں جتا رہنے والا شہ دماغ ساتھی، علی قلی خان توپ سازی پر اپنے تجربات مکمل کر چکا ہے۔ چوڑے دہانے والی دور مار توپیں جو چشم زدن میں بارود بھری بندوقیں چلانے والے سیکڑوں عسکریوں کے پرخچے اڑا سکتی تھیں۔

دریائے جمنا کے کنارے تیسرے دن کی خوں ریز جنگ، گھوڑا گاڑیوں کے پیچھے آخری وقت کے لیے بچا کر رکھے گئے دو ہزار تازہ لشکریوں نے نہیں، درحقیقت انھی توپوں نے جیتی تھی، ہرچند کہ بابر نے اس قدر فیاضی سے سپاہیوں کو خلعتیں اور انعامات عطا کیے کہ ان میں سے ہر ایک خود کو فاتح سمجھ رہا تھا۔

جنگ کے فوراً بعد، جس نے آنے والی کئی صدیوں کے لیے ہندستان کی تاریخ کا رخ متعین کر دیا، بابر نے علی قلی خان کو طلب کیا اور اسے "نادر العصر" کا خطاب عطا کیا۔ بادشاہ خطابات عطا کرنے کے معاملے میں ہمیشہ ایسے ہی فیاض تھے لیکن تاریخ میں کم ہی خطاب اتنے زیبا ہوں گے۔ کیا یہ خطاب بابر کے اپنے ذہن کی تخلیق تھا یا اس نے مولانا زین العابدین سے مشورہ کیا تھا؟ ترک سردار تھوڑی سی فارسی جانتا تھا اور فارسی کا ایک محاورہ تو وہ اکثر دہرایا کرتا تھا: "ہمہ یاراں دوزخ، ہمہ یاراں بہشت"۔ لیکن اس امر کی ہرگز کوئی شہادت نہیں ملتی کہ وہ عربی زبان کا کچھ زیادہ علم رکھتا ہو--- اور "نادر العصر" کیسی شان دار ترکیب ہے۔ وہ یقیناً ایک ڈھنگ کا نثرنگار تھا اور شاعر بھی، لیکن وہ کوئی رودکی اور سعدی تو ہرگز نہ تھا۔

اگلی صدیوں کے ان گنت مؤرخوں نے کنواہہ کی اس ہمیشہ یاد رکھی جانے والی جنگ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ظہیرالدین بابر کی ترک مے نوشی کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کئی برس پہلے مایوسی اور اضطراب کے ان تین دنوں کے سوا جب وہ مسلسل مدہوش رہا تھا، بابر کبھی بلانوش نہ تھا۔ وہ اس وقت لگ بھگ ۳۰ برس کا ہو چکا تھا جب اس نے پہلی بار شراب چکھی۔ وہ تلوار کا فرزند تھا اور تلواروں کے فرزند اپنی شامیں رنگیں نہیں کیا کرتے۔

جیسا کہ تین سو برس بعد جنم لینے والے مشرق کے عظیم الشان شاعر نے کہا تھا: یہ اسلام ہے جو مصیبت کی گھڑی میں ہمیشہ مسلمانوں کے کام آیا ہے نہ یہ کہ مسلمان، اسلام کے کام آئے------ سارے لشکر سے شراب نوشی کے طلائی برتن سمیٹے اور توڑ ڈالے گئے۔ خود پسند فاتح نماز کے مصلے پر کھڑا ہوا اور زار و

قطار روتا رہا۔ کیا یہ موزوں ہو گا کہ ہم یہاں ایک ساعت کو رک جائیں اور خود سے سوال کریں کہ آخرکار وہ کون سی چیز تھی' جس نے دشمن کی سرزمین کے وسط میں کھڑے ۱۲ ہزار اجنبی عساکر کو لوہے میں ڈوبے دو لاکھ فرزندان سرزمین پر بالادستی عطا کی۔ اللہ کی بارگاہ میں سپہ سالار کی گریہ و زاری' اس کا بے مثال عزم و ارادہ یا "نادر العصر" کی ڈھالی ہوئی وہ توپیں جن کا ہمیشہ باہم متصادم رہنے والے ہندو راجوں کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ سوال کرے کہ سیکڑوں برس کی دوری پر آج ہم اس سوال کا جواب کیسے دے سکتے ہیں کہ تفصیلات بہم نہیں اور جزئیات معلوم کرنا مشکل ہے۔ نہیں' یہ اعتراض ناقص ہے۔ جب تاریخ میں حالات کی کروٹ بدل دینے اور دل کو چھو لینے والے عظیم واقعات رونما ہوتے ہیں تو وہ کبھی ایسے قدیم اور مبہم نہیں ہوتے۔ اور یہ اعتراض تو سرے سے بے معنی ہو گا کہ ہم وہاں موجود نہیں تھے۔ ہم یقیناً وہیں تھے۔ گزرتا ہوا وقت اس طرح کے واقعات پہ گرد نہیں ڈال سکتا۔ وہ کبھی پرانے نہیں ہوتے۔ جو چیزیں ہمارے دل و دماغ میں تازہ رہتی ہیں' وہ کبھی قدیم اور کہنہ نہیں ہوتیں۔

گذشتہ صدیوں کا مؤرخ بابر کی ترک سے نوشی کی کہانی سناتا ہے لیکن وہ سالہا سال پر پھیلی ان کوششوں کا سراغ نہیں لگاتا جو "نادر العصر" کی توپیں تکمیل پانے تک بروے کار آئیں--- آخر کیوں؟ لیکن ذرا ٹھہریئے اور ساتھ ہی اس سوال کا جواب بھی عنایت فرما دیجیے کہ گذشتہ دو صدیوں کے مؤرخ' ٹیپو سلطان کی سیرت میں پلاسی کی جنگوں' سرنگاپٹم کے آخری معرکے اور اپنے بیٹوں کو یرغمال کے طور پر پیش کرنے کے سنسنی خیز واقعات کی تفصیل تو بتاتے ہیں لیکن ایک جدید بحریہ اور ایک بالکل ویسا نہری نظام تشکیل دینے کے لیے اس نادر بادشاہ کی عرق ریزی کیوں بیان نہیں کرتے' جیسا کہ بعدازاں انگریزوں نے بنایا اور اب تک ایک عجوبہ مانا جاتا ہے۔ اگر آپ میری خطا معاف کر دینے پر آمادہ ہوں تو میں اس سوال کا جواب دینے کی جسارت کرتا ہوں۔ نہایت مؤدبانہ التماس یہ ہے کہ بابر کے جانشینوں میں سے کوئی ایک بھی نہیں تھا جو سائنس اور ٹکنالوجی کی فضیلت اور اہمیت سے رتی برابر بھی آشنا ہو۔ میں پھر دہراتا ہوں کہ رتی برابر بھی نہیں' ایک ذرہ بھی نہیں۔ اس معاملے میں سب کے سب بہت ہی بے نیاز واقع ہوئے تھے' سوائے اس ایک آدمی کے جس کا نام فتح علی خان تھا جو حیدر علی کا فرزند تھا اور جسے تاریخ نے ٹیپو کے نام سے یاد رکھا۔

یہاں ایک چھوٹا سا سوال اور ہے جو کسی بھی قلب کے کسی گوشے میں ابھر سکتا ہے۔ کیا بابر کی توپیں خوش قسمتی سے برپا ہونے والا ایک حسن اتفاق تھیں؟ آخر فرغانہ کے جنگلوں میں ننگے پاؤں گھومنے پھرنے' دیر تک دوستوں سے اشعار اور حکایات سننے اور سنانے والا شہزادہ' کہاں کا سائنس دان تھا؟ جی نہیں' خوش قسمتی سے تاریخ نے ہمارے لیے تھوڑی سی تفصیلات کو محفوظ رکھا ہے۔ علی قلی خان نے آخری کامیابی سے

پہلے بہت سے ناکام تجربات کیے۔ غور طلب یہ ہے کہ ہر ناکام تجربے پر بھی اسے بادشاہ نے ہر بار اتنا ہی انعام دیا جتنا آخری اور عظیم الشان کامرانی پر--- پورے ایک لاکھ روپے' جو آج کے معیار سے لگ بھگ چار کروڑ ہوتے ہیں۔

جب سترھویں صدی کے برطانیہ میں سائنس سوسائٹیوں کا ایک طوفان امڈ آیا تھا' جب برلن اور برطانیہ میں صنعتی عہد کی نیو اٹھائی جا رہی تھی' جب یورپ میں آکسفورڈ اور کیمبرج کی بنیاد رکھی جا رہی تھی تو ہمارے اجداد کیا کر رہے تھے؟ ہاں وہ کنیزوں کے لیے ایسے لباس بناتے تھے جو ایک شب برتنے کے بعد بیکار ہو جائیں۔ وہ تاریخ انسانی کی سب سے خوب صورت عمارت تاج محل کی جزئیات پر عرق ریزی کر رہے تھے' مغرب چار صدیوں کے بعد بھی' جس کا جواب نہیں دے سکتا۔ ان کے جولاہے لکڑی کی کھڈیوں پر ایسی چھینٹ بناتے تھے' پیرس اور لندن کی حسینائیں جسے اشتیاق سے پہنتی اور پڑوسنوں پر رعب جماتی تھیں۔ سری نگر میں بننے والی پشمینے کی شالیں دیکھ کر یورپی رؤسا کے سانس رک جاتے تھے اور وہ ان کی منہ مانگی قیمت ادا کرنے پر آمادہ رہتے۔ برعظیم کے بحری جہاز بنانے والے اتنے چابک دست تھے کہ نگاہیں دیکھتی تو بس دیکھتی ہی رہ جاتیں۔ بس یہ ہے کہ وہ سارے کے سارے کام اپنے ہاتھوں سے انجام دینا پسند کرتے تھے۔ اگر مشینوں سے نفرت نہیں تو وہ انھیں ناپسند ضرور کرتے تھے۔ وہ آرام اور آسودگی میں رہنا پسند کرتے تھے۔ مشینوں کا شور اور ان کی پیچیدگیاں انھیں گوارا نہ تھیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بابر کی تاریخ ساز فتح' علی قلی خان کی توپوں سے پھوٹی تھی؟ جی نہیں' علی قلی خان کی توپیں' بابر اور اس عظیم عسکری دماغ کے عزم و ارادے کی قوت سے طلوع ہوئی تھیں۔ چار سو سال بعد جب لاہور کے شاعر نے اس راز کو واشگاف کرنے کی کوشش کی کہ کامیاب اور ناکام آدمی' کامران اور ناکام معاشروں کا فرق کیا ہوتا ہے تو معلوم نہیں کنواہہ کی جنگ ان کے ذہن میں تھی یا نہیں تھی۔ لیکن میرا گمان کہتا ہے کہ حیات انسانی کے سب اسرار کے گرہ کشا آخر الانبیا' ابو قاسم' محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ضرور ان کا رہنما ہو گا کہ زندگی ایک سواری کی طرح ہے۔ اگر تم اس پر سوار نہ ہو گے تو یہ تم پر سوار ہو جائے گی۔ (مفہوم) شاعر کے اپنے الفاظ یہ تھے:

راز ہے راز ہے تقدیر جہان تگ و تاز
جوش کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوش کردار سے شمشیر سکندر کا طلوع
کوہ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز

(بال جبریل ' ص ۱۴۹-۱۵۰)

بابر کے آخری باجبروت جانشین اورنگ زیب عالم گیر نے کمال فخر کے ساتھ کہا تھا کہ اس نے ۴۰ برس

تک تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھ کر حکومت کی ہے لیکن افسوس کہ فتاویٰ عالم گیری کی تدوین کا عظیم الشان کارنامہ انجام دینے والے بادشاہ کے دور میں کسی آکسفورڈ تو کجا کسی الازہر کی بنیاد بھی نہ رکھی جا سکی۔ وہ شاہ رحیم رحمتہ اللہ علیہ کو سیکڑوں دیہات پر پھیلی جاگیر عطا کرنے پر آمادہ تھے۔ حالانکہ اپنے عہد کے اس بے مثل عالم کو جاگیر نام کی کسی چیز سے ہرگز کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن ان کے ذہن میں صنعت و حرفت کی ترقی، جدید علوم کی لگن اور کسی عظیم تعلیمی ادارے کا تصور نہ ابھر سکا۔ صدیوں کی غلامی کے تجربے سے گزرنے والا برعظیم کا مسلمان آج بھی عالم گیر کا نام احترام سے لیتا ہے، وہ انھیں رحمتہ اللہ کہہ کر یاد کرتا ہے۔ اور کبھی غازی عالم گیر کہتا ہے کہ وہ قرآن مجید کی کتابت اور ٹوپیاں سی کر رزق طیب کماتے تھے۔ لیکن اگر کسی کا دل نہ دکھے تو واقعہ یہ بھی ہے کہ ساری دینی حمیت کے باوجود اس باوقار بادشاہ کو دربار کے آداب پر شدید اصرار تھا۔ اس کے عہد میں امرا کی بدعنوانیاں اپنے عروج پر پہنچ چکی تھیں اور آخرکار اس نے اقتدار کی باگ اس شہزادے کو سونپ دی جو بستر مرگ پر پڑے باپ کے لیے موت کی دعا مانگ رہا تھا اور بادشاہ ٹوٹتے ہوئے سانس کے ساتھ فارسی کا ایک شعر مسلسل دہرائے جاتا تھا۔

به هر لحظه به هر ساعت به هر دم
دگرگوں می شود احوال عالم

یورپ نے مشین ایجاد کر لی اور جمہوریت بھی، مگر ہم گلی سڑی بادشاہت سے چمٹے رہے۔ خوئے غلامی کے مارے ہندستان میں ہم نے زندگی کی باگ جاگیرداروں، شہزادوں، والیوں راجوں اور بادشاہوں کو سونپے رکھی اور مغرب نے سلطنت کے امور کی ذمہ داری پہلے جاگیرداروں سے چھین کر بادشاہ کو عطا کی، پھر بادشاہ سے پارلیمان کو اور آخر میں پارلیمان سے عام آدمی کے حوالے کر دی۔

یہ اٹھارویں صدی کا زمانہ تھا، جب پنجاب میں شرح خواندگی ۸۰ فی صد تھی، جب برعظیم کا تقریباً ہر مسلمان شمشیرزنی اور گھڑسواری کا ہنر رکھتا تھا لیکن یہ ہنر ہمارے کام نہ آ سکا کہ علم کی دنیا کے انفس و آفاق بدل گئے تھے اور ہم زمانے کے ساتھ موڑ کو تبدیل کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ ہمارے لیے جو کچھ کرنا ہے، بادشاہوں کو کرنا ہے۔ ہمارا کام تو ریت کے ذروں کی طرح آندھیوں میں بہنا اور تنکوں کی طرح اڑتے چلے جانا ہے۔ ہمارے مدرسوں میں چھ سو برس پہلے مرتب کیے گئے نصاب پر اصرار کیا جاتا تھا اور جیسا کہ آج بھی ہے، حتیٰ کہ جو لوگ اسے بدلنے کی بات کرتے ان پر کفر کے فتوے لگائے جاتے۔

افسوس کہ بابر کے جانشینوں میں کوئی مامون الرشید نہ تھا۔ سب محمد امین جیسے تھے جو شکار کھیلتا تو اس کے لیے مچھلیوں کے نتھنوں میں موتی پروئے جاتے تھے، جسے گویے گھیرے رکھتے تھے اور جو عورتوں سے مشورہ کرتا نظر آتا تھا۔ مغلوں کے ہاں علم کو کبھی وہ اکرام نصیب نہ ہو سکا جو تلوار کو حاصل تھا۔

ایک بار پھر پیچھے پلٹ کر دیکھیے۔ حجاز کے وہ سخت جان جو عراق' ایران اور بلوچستان کے راستے ہزاروں میل کا سفر کر کے دیبل کی بندرگاہ تک پہنچے تھے' ان کے ساتھ اونٹوں کی طویل قطاریں تھیں' جن پر سرکے میں بھگو کر خشک کی گئی روئی کے ڈھیر پڑے تھے لیکن وہ اپنے ساتھ ایمان کی خیرہ کن قوت اور تسخیر کے بے پناہ عزم کے علاوہ دو اور چیزیں بھی لے کر آئے تھے۔ وہ منجنیقیں جو قلعوں کے اندر دیواروں کے عقب میں آگ بھڑکا دیتی' اور دشمن کے حوصلے توڑ ڈالتی تھیں اور اخلاق کا وہ نظام جس کی برعظیم کی تاریک سرزمین نے کبھی ایک جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ اخلاق کا یہ نظام ایک عظیم الشان علمی ورثے پر استوار تھا کہ ایک اعتبار سے اخلاق بھی علم ہی کی ایک شاخ ہے جو تربیت سے صیقل ہو کر اور روایت بن کر طرز حیات ہو جاتی ہے۔

بے شک سندھ کی تاریک شبوں میں ان کے فولادی بازو پھڑپھڑاتی شمعوں اور شمعوں کی طرح لو دیتی تلواروں کے ساتھ فضاؤں میں بلند ہوتے تھے لیکن ان کا اصل امتیاز یہ تھا کہ وہ تاریخ انسانی کے پہلے جنگجو تھے جو جنگ کے جنون اور وحشت میں بھی' بچوں' بوڑھوں اور عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے' جو مفتوحہ شہروں کو لوٹتے نہیں تھے' جو کچی دیواروں والے قدیم کارخانوں میں کاشت کاری کے آلات بناتے' کاریگروں اور کھیتوں میں مصروف کسانوں کو امان دیتے تھے۔ ندیوں اور دریاؤں کے کنارے اُگے ہوئے درخت اور فصلیں جن کے غضب سے محفوظ تھیں۔

میں حیران ہوں کہ مسلم مورخ اور خطیب ان جانبازوں کی شجاعت اور کشادہ دلی کا ذکر تو کرتے ہیں' اس نظام اخلاق پر کیوں تفصیل سے روشنی نہیں ڈالتے۔ وہ محمد بن قاسم کی عظمتوں کے گن گاتے ہیں تو وجد میں آ جاتے ہیں لیکن یہ کیوں بیان نہیں کرتے کہ اس کے لشکری بھی ایسے ہی تھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی نہ تھا' جس نے کبھی کسی بے بس خاتون پر دست درازی کی ہو۔ وہ یہ کیوں بیان نہیں کرتے کہ یہ اسی اخلاق کا کمال تھا کہ سندھ کے کناروں پر آباد ایک ہزار برس سے ہر طرح کے ستم سہہ کر بودھ مت کو سینے سے لگائے رکھنے والے سومرو چرواہے اسلام کے سامنے سرنگوں ہوئے اور اس کے باوجود سرنگوں ہوئے کہ ان کے سروں پر کوئی تلوار معلق نہ ہوئی تھی۔ ہمارے مورخ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ اس عہد کا سب سے بڑا علم سپاہ گری تھا اور اس میں مسلمانوں کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اس عہد کی معیشت' صنعت نہیں تجارت پر استوار تھی اور مسلمان ملاح وہ تھے جن سے کسی قوم کا موازنہ ممکن ہی نہ تھا۔ وہ کیوں نہیں بتاتے کہ محمد بن قاسم اسلامی تاریخ کا پہلا سالار نہ تھا' جسے ۱۷ برس کی عمر میں قیادت اور کمان سونپ دی گئی ہو۔ نصف صدی پہلے یہ معجزہ مدینتہ النبیؐ میں برپا ہو چکا تھا' جب ابوبکر صدیقؓ اور عمرؓ بن خطاب' تاریخ انسانی کے ان عظیم الشان حکمرانوں کو ایک کمسن لڑکے کے لشکر میں شامل ہونے کا حکم ملا اور انھوں

نے بلاچون و چرا اس حکم کی اطاعت کی۔ ہمارے مورخ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ ملوکیت کی لعنت کا شکار ہو جانے کے باوجود مسلمان معاشرے میں اب بھی علم اور تقویٰ کو بڑی فضیلت حاصل تھی۔

جزیرہ نمائے عرب، یمن، ایران، عراق، اردن، شام اور مصر کا حکمران مروان حج کے سفر پر مکہ مکرمہ آیا تو فقیہہ مکہ عطاء بن ابی رباح کے قدموں میں عاجز بن کر بیٹھا رہا اور جب شہزادوں نے اس حبشی اور کم رو عالم کی بے اعتنائی پر تعجب کا اظہار کیا تو اس نے انکساری سے کہا: جان پدر! بات یہ ہے کہ تمھارے باپ کو اس کی ضرورت ہے اور اسے تمھارے باپ کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔

یہی عطاء بن ابی رباح تھے جو ایک گدھے پر سوار، پانچ درہم کی قمیض پہنے مکہ سے دمشق گئے تو بادشاہ نے انھیں اپنے تخت پر بٹھایا اور ان کے مشورے پر مکہ و مدینہ کے باشندوں پر عائد کردہ ٹیکس واپس لینے، سرحدوں پر مامور سپاہیوں کی تنخواہیں بڑھانے اور حجاز کے لیے پانی کی ایک نہر کھدوانے کا بخوشی حکم دینے کے بعد داد طلب نگاہوں سے بوڑھے عالم دین کی طرف دیکھا اور کہا: "کوئی اور حکم؟" تو اس کم کلام آدمی نے کہا: "ہاں، اپنے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو کہ قیامت کے دن تمھارے اعمال کے سوا کوئی چیز تمھاری مددگار نہ ہوگی"۔

وہ اپنے پیچھے خوف خدا سے روتے ہوئے حکمران کے علاوہ اشرفیوں کی ایک تھیلی چھوڑ آئے تھے۔ مروان نے اس تھیلی کو دیکھا تو ایک بار پھر رو دیا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے عالم گیر تنہائی کے لمحات میں جاگیر کے لیے جاری کردہ فرمان پر شاہ عبدالرحیم کے انکار کی عبارت پڑھ کر رو دیا کرتا تھا۔

ہم اس وقت بالادست اور کارگر تھے جب تقویٰ ہمارا زاد راہ اور علم ہمارا اثاثہ تھا، جب ہمارے عطاء بن ابی رباح اور شاہ عبدالرحیم، مروانوں اور عالم گیروں پر غالب تھے۔ لیکن پھر جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے صدیوں کے سفر میں آخرکار روشنی کے نگہدار تھک کے ڈھے پڑے اور آفتاب غروب ہوگیا۔ پھر قسطنطنیہ میں سلطان عبدالحمید رہ گئے جنھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ عرب کے ریگزاروں میں ان کی رعایا ان پہ برہم ہو چکی، اور دہلی کے لال قلعے میں بہادر شاہ ظفر تھے، جن کے لیے موتیا کی خوشبو والا قیمہ پکانے کے لیے سیکڑوں مالنیں اور درجنوں باورچی درکار ہوتے اور مزاج موزوں رکھنے کے لیے ابراہیم ذوق اور اسد اللہ غالب میں قصیدہ نگاری کا مقابلہ جاری رہتا۔

جب ہم تھک جاتے ہیں اور کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی تو ہم کیا کرتے ہیں؟--- ہم پلٹ کر دیکھتے ہیں کہ ہم محروم نہیں رکھے گئے۔ ہمارے لیے ۱۴ سو سال پہلے کے ایک صحرائی شہر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روشنی کا چراغ موجود ہے۔ ولقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ۔

سوال یہ ہے کہ یہ نمونۂ عمل کیا ہے۔ کیا محض عبادت اور پاکیزگی؟ سخاوت اور انسانی ہمدردی؟ سادگی اور شجاعت------ شاید اس سے بہت بڑھ کر، شاید اس سے بہت سوا۔

آخر کوئی سبب تو ہو گا کہ مجروح بلالؓ جیسے ہی ہوش میں آئے، ابوبکر صدیقؓ، اس کم گو اور روشن ضمیر کو سب سے پہلے جو فکر لاحق ہوئی وہ یہ تھی کہ بلالؓ لکھنا پڑھنا سیکھ لیں۔ وہ ان کے لیے نیل کے پتے لے کر آتے اور بھگوئے رکھتے کہ سیاہی بن جائے۔ وہ ان کے لیے سرکنڈے کا قلم بناتے اور انھیں لکھنا سکھاتے۔ وہ انھیں ایک اور چیز بھی سکھاتے تھے، بار بار اصرار اور دردمندی کے ساتھ، اور وہ یہ تھی کہ بلالؓ آواز دینے اور بلانے پر بھاگ کر نہ آیا کریں۔ وہ اطاعت اور تعمیل کے لیے تعجیل سے کام نہ لیں کہ اب وہ ایک آزاد آدمی ہیں--- آزاد آدمی، آزاد آدمی--- اگر غور کیا جائے تو یہی مرد آزاد، اسلام کا منشور ہے، جو بندوں کی غلامی سے انکار کردے اور خدا کے سوا کسی کو اپنا بادشاہ تسلیم نہ کرے، جس کے قدموں میں ضمیر اور ایمان کے سوا کوئی زنجیر نہ ہو اور یہی وہ مرد آزاد ہے جو مسلم برعظیم کی ۱۴ سو سالہ تاریخ میں اسے کبھی عطا نہیں ہوا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ کوئی معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا، محفوظ نہیں رہ سکتا، امن، امید اور امنگ سے ہمکنار نہیں ہو سکتا، اگر اس کے ادارے کمزور اور کم تر ہوں۔ اگر اس میں قانون کی قوت سب قوتوں پہ غالب نہ آجائے۔ لیکن افسوس اس امر کا سب سے کم ادراک کیا جاتا ہے کہ علم کی بے پناہ لگن کے سوا ان مقاصد کا حصول اسی طرح ناممکن ہے، جیسے پانی کے بغیر روئیدگی کا--- کسی ملک اور معاشرے کو معاشی و اقتصادی ترقی کی آرزو ہو، دشمن اقوام کی وحشت سے نجات کی یا وحی کی روشنی میں دنیوی و اخروی زندگی کو منور کرنے کی، آخر بنی نوع انسان کے سامنے تلاش و تحقیق، غور و فکر اور حصول علم کے سوا اور کون سی راہ کھلی ہے!

آخر کوئی سبب تو ہو گا کہ نبی امیؐ مسجد نبویؐ کے چبوترے پر خود کو تحصیل علم کے لیے وقف کر دینے والے اصحاب صفہ کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ کوئی گہرا اور روشن راز تو ہے کہ قرآن مجید بار بار کائنات میں تفکر پر آمادہ کرتا اور یہ قرار دیتا ہے کہ یہ عمل اللہ کی عبادت سے بھی افضل و اشرف ہے۔ آدمی پڑھتا ہے اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ عالم کے قلم کی سیاہی شہیدوں کے خون سے افضل ہے۔ ان شہیدوں کے لہو سے افضل جو حساب لیے بغیر فردوس بریں کی وسعتوں میں داخل کیے جائیں گے۔

یہ ہے علم کی عظمت و فضیلت اور یہ ہے ہمارے جہل کا عالم اور اس پر بھی ہم حیرت کرتے ہیں کہ خوار و زبوں کیونکر ہیں؟ پامال اور دردمند کیوں ہیں؟ بخدا مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ ہم زندہ کیسے رہے، پامال اور تباہ کیوں نہ ہو گئے کہ ہمارے مدرسے ہزار برس پہلے کا نصاب پڑھاتے اور ہمارے اسکول مغرب سے مرعوبیت کے سوا کسی چیز کی تعلیم نہیں دیتے۔ ایک بوڑھے آدمی کے سوا، اور اسے بھی چند آیات یاد کرنے کا حکم دیا گیا تھا، اللہ کے رسولؐ نے تو کسی کو تعلیم سے استثنیٰ نہ دیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی

زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ کی مخلوق کو تعلیم دینے ہی میں گزرا۔ سکھانے' تربیت کرنے' ضبط نفس کا جذبہ اجاگر کرنے' اور اللہ سے بندے کا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے میں۔

حضرت فاطمہؓ حیا اور خود داری کی پیکر' فاطمہ الزہراؓ' کنیز کے لیے التجا کرنے آئی تھیں کہ چکی چلاتے اور پانی کھینچتے ہاتھوں پر نشان پڑ گئے تھے' اور ہم جانتے ہیں کہ ہاشمیوں کی جلد کیسی نازک ہوتی تھی' لیکن اللہ کے رسولؐ نے انکار کر دیا۔ ان کے پاس جو کچھ تھا' وہ اصحاب صفہ کے لیے بچا رکھا تھا۔ کون جانتا ہے کہ عمر بھر رشتوں اور تعلقات کے تقاضوں کو ہمیشہ ازبر رکھنے والے فاطمہؓ کے باپ پر کیا گزری تھی۔ لیکن ہم جانتے ہیں رات ڈھلی تو باپ نے بیٹی کے گھر کا رخ کیا اور اس پاک زاد کو وہ تسبیح تعلیم کی جو مسلمان عورتیں ۱۴ سو برس سے دہراتی چلی آئی ہیں۔ محمدؐ تو تالیف قلب بھی تعلیم سے کرتے تھے۔

اب آیئے اس سوال کی طرف کہ اکیسویں صدی میں تعلیم کے تقاضے کیا ہیں؟ اگر دیکھا جائے تو چودھویں صدی سے مختلف نہیں ہیں۔ اس کے سوا کہ تین صدی پہلے کے صنعتی انقلاب کے بعد ہر گزرنے والے دن کے ساتھ ٹکنالوجی کی اہمیت بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اگر نومبر کے گلابی جاڑے میں گندم کے بیج ڈال دینے کے بعد دسمبر میں ابر نہ برسے تو ہر گزرتے دن کے ساتھ پانی کی ضرورت شدید تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اگر جنوری کا آسمان بادلوں سے خالی رہے اور پھر فروری کے دن بھی بیت جائیں تو اپریل میں کھلیانوں سے صرف تھوڑا سا بھوسا سمیٹا جا سکتا ہے' گیہوں نہیں--- امت مسلمہ تعلیم کے میدان میں پہلے ہی اتنی پیچھے رہ گئی کہ گویا فروری کا آغاز ہو چکا اور اب ہم مزید تاخیر کے متحمل نہیں ہو سکتے--- یہاں تعلیم سے میری مراد جدید علوم بھی ہیں' ٹکنالوجی بھی اور اللہ کی آخری کتاب اور سیرت رسولؐ پہ غور و فکر بھی کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک سے بھی محرومی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ایک محرومی فی الجملہ ہماری دنیا اجاڑ دے گی اور دوسری آخرت برباد کر دے گی۔

مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ جو قوم کسی خاص سبب کے بغیر' محض کاہلی اور لاابالی پن سے اپنی دنیا برباد کر دے تو وہ شاید اپنی آخرت کا سامان بھی نہ کر سکے۔ ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ انسان مستعد ہوتے ہیں یا غیر مستعد۔ وہ کسی ایک پہلو میں متحرک اور دوسرے میں غیر فعال نہیں ہو سکتے۔

اب سوال کا صرف آخری حصہ باقی ہے۔ فرض کیجیے اگر گزرے ہوئے وقت کا ماتم ترک کر دیا جائے اور آج سے پوری قوم حصول علم کے لیے کمر کس لے تو کیا گزرے وقت کی تلافی ممکن ہے؟ میرا جواب یہ ہے' جی ہاں ممکن ہے اور میری دلیل یہ ہے کہ پاکستان شرح خواندگی کے اعتبار سے ۱۳۲ ویں نمبر پر ہے لیکن ایٹمی صلاحیت کے اعتبار سے چھٹے نمبر پر۔ پاکستان جوہری سائنس اور میزائل سازی میں بھارت سے بہتر ہے۔ اس کے پاس ۳۰ اور ۴۰ سال کی عمر کے درمیان سائنس دانوں کی ایک ایسی کھیپ موجود ہے جن کا دنیا کے کسی بھی ملک سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ بھارتی سائنس دانوں

کو میزائل کا ٹھوس ایندھن بنانے میں پورے پانچ برس لگ گئے لیکن پاکستان کے جس سائنس دان نے سوا دو سال میں دنیا کا بہترین میزائل تخلیق کیا' اس نے یہ ذمہ داری سنبھالنے سے پہلے کبھی ننگی آنکھ سے اس ہتھیار کو دیکھا تک نہیں تھا۔ پھر جب یہ میزائل داغا گیا تو اس کا نشانہ ایسا درست تھا کہ اگر مقررہ مقام پر لمبوترا حجازی تربوز دھرا ہوتا تو وہ اسے درمیان سے قطع کر سکتا یا نہ کر سکتا' ایک کونے سے ضرور جا ٹکراتا۔

سادہ سا حساب کتاب یہ ہے کہ اگر پاکستان صرف ۱۰ برس میں وہ ایٹمی ٹکنالوجی حاصل کر سکتا ہے جو عرب اور ایرانی سیکڑوں گنا وسائل کے باوجود تین عشروں میں نہیں حاصل کر سکے تو پھر ایسا کیوں ہے کہ نسبتاً کہیں پس ماندہ مصر کے کھیتوں میں کپاس کی پیداوار پاکستان سے تین گنا اور خود مشرقی پنجاب میں دوگنا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہمارے نیم جاگیردارانہ سماج میں تعلیم کی اہمیت کا کبھی ادراک ہی نہ کیا گیا اور جہاں کہیں ایسا ہوا' وہاں معجزے رونما ہو کر رہے۔

حال ہی میں' مجھے اس ۳۰ سالہ سائنس دان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا' جس نے پاکستانی میزائل کا گائیڈنس سسٹم تشکیل دیا ہے۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی' جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ سسٹم پی ایچ ڈی کے اس مقالے کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا جو اس نوجوان نے دو برس میں مکمل کیا تھا اور یہ کہ اب یہ مقالہ مغربی جامعات میں نصابی کتاب کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ جب ایک بزرگ سائنس دان اس نوجوان کی موجودگی میں یہ ساری تفصیل بیان کر رہا تھا تو وہ خاموش رہا اور اس نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ لبریز پیالہ اپنے بارے میں کبھی کچھ نہیں کہتا' آواز تو خالی برتنوں سے پھوٹتی ہے۔

کیا پاکستانی معیشت چند برس میں کوریا اور ملائیشیا کے ہم پلہ ہو سکتی ہے؟ جی ہاں' بالکل ہو سکتی ہے۔ کیا پاکستان کی زراعت اس قدر فروغ پا سکتی ہے کہ پانچ برس میں سیکڑوں ارب روپے کا زرمبادلہ کمانے لگے؟ جی ہاں۔ اور یہ بات میں نہیں کہتا' سائنس دان کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان کی زراعت پانچ برس میں تین سو فی صد ترقی سے ہمکنار کی جا سکتی ہے۔ اس پر حیران ہونے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں' یہ مصر کے برابر ہو گی' کینیڈا اور امریکہ سے کم۔ حیران ہونے کی اس لیے بھی ضرورت نہیں کہ آسٹریلیا میں جو ہم سے کہیں زیادہ پیداوار حاصل کرتا ہے' زرخیز مٹی کی تہہ بعض مقامات پر سات انچ سے زیادہ نہیں اور پاکستان میں کہیں بھی کئی فٹ سے کم نہیں ہے۔

سائنس دان تو یہ بھی بتاتے ہیں کہ اگر انھیں وسائل فراہم کر دیے جائیں تو وہ ایک مختصر سے عرصے میں ایسے ایٹمی میزائل بنا سکتے ہیں کہ اسرائیل اور امریکہ کی بلیک میل کرنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جائے اور آئے روز دھمکیاں دینے والے اسی طرح منہ میں گھاس لے کر ہمارے پاس آئیں' جیسے ہنری کسنجر اور اس کے بعد صدر نکسن چو این لائی کے پاس گئے تھے۔ چینیوں کے ہاتھ میں ترپ کا کون سا پتا تھا؟ صرف ۲۰/ ایسے ایٹمی میزائل جو امریکی شہروں کو نشانہ بنا سکیں۔ ہم صرف ایک موٹر وے کی قیمت میں ۴۰/ ایسے

میزائل بنا سکتے ہیں۔

تو پھر ہم بناتے کیوں نہیں؟ کیا اس لیے کہ ہمارے پاس وسائل موجود نہیں؟--- گذشتہ روز سی بی آر کے ایک ایسے عہدے دار سے میری مفصل ملاقات ہوئی' جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ دریا میں رہ کر بھی اپنے لب خشک رکھتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اگر سی بی آر کی سربراہی ایک سخت گیر اور ایمان دار افسر کو سونپ دی جائے جو کسی بھی طرح کی سفارش ماننے سے انکار کر دے اور جو اپنے ماتحتوں کا جذبہ عمل بیدار کر کے ان سے کام لے سکتا ہو تو زیادہ سے زیادہ دو سال کے اندر قومی آمدن میں ۲۰۰/ ارب روپے سالانہ کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ اگر ۲۰۰۰/ارب روپے کی متوازی کالی معیشت کو ٹیکس کے جال میں شامل کیا جا سکے تو یہ اضافہ ۴۰۰/ ارب روپے تک ممکن ہے۔ ایک دوسرا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اگر ٹیکس کے موجودہ قوانین ختم کر کے زکوۃ اور عشر کے اسلامی قوانین نافذ کر دیے جائیں تو یہ آمدن کم از کم ۱۲۰۰/ ارب سالانہ ہو گی۔

تو پھر ایسا ہوتا کیوں نہیں؟ جی ہاں' نہیں ہو سکتا کیونکہ حکمران یا تو اپنے مفادات کی حفاظت کر سکتے ہیں یا پھر اپنے وطن اور رعایا کی۔ اور جو لوگ بیساکھیوں پر کھڑے ہوں' بیرونی بنکوں میں جن کے اربوں ڈالر پڑے ہوں اور استعماری ممالک کی خفیہ ایجنسیوں کے پاس ان کھاتوں کی تفصیلات موجود ہوں وہ زنجیریں کاٹ نہیں سکتے' ان میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ وہ بوجھ ختم نہیں کر سکتے' بڑھا سکتے ہیں۔

اور بیرون ملک پاکستانی؟--- وہ ۸/ ارب ڈالر سالانہ بچاتے ہیں۔ وہ ابھی پچھلے برس تک اپنی بچتوں کا ایک حصہ پاکستان میں جمع کرایا کرتے تھے لیکن بیرونی کرنسی کے کھاتے منجمد ہونے کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہوا--- سوال یہ ہے کہ اگر اس ملک میں امن و امان کی مثالی فضا قائم ہو جائے اور اس ۸/ارب ڈالر میں سے نصف رقم بھی پاکستان آنے لگے؟--- ۴/ارب ڈالر سالانہ۔ اور اطلاعاً عرض ہے کہ اگر افغانستان میں امن قائم ہو جائے اور وسطی ایشیا کے ممالک کراچی کے راستے سمندری تجارت کا آغاز کر دیں تو ایک اندازے کے مطابق پاکستان کو راہداری کے عوض کم از کم دو ارب ڈالر سالانہ حاصل ہوں گے۔

لیکن یہ سب کون کرے؟ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے؟ کم از کم مغلوں کے جانشین تو نہیں باندھ سکتے کہ مغل دربار میں تعلیم نہیں صرف تلوار معتبر تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے معاشرے میں جاگیرداروں کے بل پر بروئے کار آنے والے مغل اقتدار کا خاتمہ نہیں ہو سکا۔ صرف یہ ہوا ہے کہ بیچ میں دو سو برس انگریزوں کو مل گئے اور ہر استعمار کی طرح وہ ہمارے ہاں ایک تیسری جنس چھوڑ گئے' جس کا بس چلے تو سجدہ بھی نیویارک میں مجسمہ آزادی کے رخ پہ کیا کریں۔

میں اعلیٰ تعلیم کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں جتنا محمد شریف منجم توپ سازی کا علم رکھتا تھا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کنواہہ کی جنگ جیتنے کے بعد بابر نے منجم کو معاف کر دیا تھا بلکہ گذشتہ خدمات کے صلے میں

ایک لاکھ روپے بطور انعام عطا کیے۔ پھر بابر نے اسے ہندستان سے نکل جانے کا حکم دیا کہ گذشتہ حملوں کے برعکس اب وہ لوٹ جانے کا نہیں' برعظیم میں قیام کرنے اور ایک مستقل حکومت بنانے کا عزم رکھتا تھا۔ اب وہ محمد شریف اور اخلاص خان ایسے شاکی اور کمزور رفیقوں کا روادار نہ تھا۔ ہند کے کفرزار میں اسلام کی فتح پر اس نے ایک رباعی لکھی اور مولانا زین العابدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے ادب سے ان کے گھٹنوں کو چھوا اور نومسلموں کے سے جوش و خروش سے کہا: "اسلام کی فتح کے لیے میں جنگلوں میں آوارہ پھرتا رہا"۔ مولانا مسکرائے اور قرآن کی ایک آیت پڑھی کہ خود پرست بادشاہ زعم اور نفس پروری کا شکار نہ ہو۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ منجم کے برعکس بابر نے مولانا زین العابدین کی خدمت میں کوئی نذر پیش نہ کی۔ آدمی حیرت اور رنج سے سوچتا ہے کہ اگر بابر منجم کے ایک لاکھ اور ہمایوں کے ایک کروڑ میں سے کچھ حصہ مولانا کو فروغ علم کے لیے پیش کرتا تو کیا مسلم برعظیم کی تاریخ مختلف نہ ہوتی؟ اس وقت جب ایک ہندستانی روپیہ ۴۸ برطانوی پاؤنڈز کے برابر تھا اور برعظیم میں زراعت' پارچہ بافی اور جہاز سازی سے حاصل ہونے والی کل آمدن سارے کرۂ ارض کی کل پیداوار کا ۲۵ فی صد تھی۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مغلوں کے دربار میں تعلیم نہیں تلوار معتبر تھی۔ جب تک تلوار پہ تعلیم کو اور جاگیرداروں پہ جمہوریت کو غلبہ حاصل نہ ہو گا' ہم اکیسویں صدی تو کیا اٹھارویں صدی کے تقاضے بھی پورے نہ کر سکیں گے۔ ہمارے امرا کے بچے حصول تعلیم کے لیے آکسفورڈ اور کیمبرج کا رخ کرتے رہیں گے اور ہمارے غریب حسرتوں میں جینے یا خودسوزی کا بھیانک خواب دیکھا کریں گے--- اور اگر ان میں سے کوئی فارسی کی شد بد حاصل کر لے گا تو شاید گاہے بہ گاہے وہ شعر پڑھا کرے گا جو ۱۷۰۷ میں وفات پانے والا اورنگ زیب عالم گیر بستر مرگ پر دہراتا رہا:

به هر لحظه به هر ساعت به هر دم
دگرگوں می شود احوال عالم

اگر ہمیں اکیسویں صدی میں ایک آزاد اور خودمختار قوم کے طور پر داخل ہونا ہے تو دست وحشت کو بروئے کار لانا ہو گا اور اپنی زنجیر توڑ پھینکنا ہو گی کہ جو پابہ رسن ہوں وہ ابھر نہیں سکتے۔ وہ صرف روشنی کی آرزو کر سکتے ہیں' اسے پا نہیں سکتے۔

ماہرین تعلیم سے میری گزارش یہ بھی ہے کہ جب وہ نئی صدی کے تعلیمی تقاضوں پر غور و فکر کریں تو براہ کرم اس سوال کا جواب دینے کی کوشش بھی کریں کہ ملوکانہ ذہنیت کو علم کے فروغ سے وحشت کیوں ہے اور یہ کہ غلاموں کے گروہ حصول علم کی آرزو بھی رکھتے ہیں یا محض زندہ رہنے کی؟ (یہ مضمون اسلامی جمعیت طلبہ کے زیر اہتمام منعقدہ سیمی نار' بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد میں پڑھا گیا)۔

مغرب میں اسلام اور مسلمان

چیلنج اور امکانات

ڈاکٹر انیس احمد ○

مغرب کی علمی روایت میں "اسلام اور مسلمان" کا موضوع تہذیب و ثقافت کے حوالے سے، تصادم نہ سہی تو بھی، ثقافتی امتیاز، دوری اور علیحدگی کی فضا میں زیر بحث آتا ہے۔ اسی طرح مسلمان بھی عموماً مغرب کو اپنا ثقافتی مخالف اور اسلامی نظریہ حیات کے دشمن کی شکل میں دیکھتے ہیں جب کہ مغرب، اسلام کے وجود، بیداری اور احیا کو ایک "آزادی اور جمہوریت کی مخالف قوت" تصور کرتا ہے۔ مغرب کے اس لگے بندھے رویے کی جھلک ان افراد کے ساتھ اس کے مجموعی رویے میں دیکھنے میں آتی ہے جو اس کی سرزمین کے باشندے ہیں لیکن ان کا مذہب مختلف ہے۔ اس رویے کی ایک واضح شہادت عیسائی سربوں اور کروٹ کے ہاتھوں بوسنیا (اور اب کوسووا) کے مسلمانوں کی نسلی صفائی (ethnic cleansing) ہے۔ بوسنیا کے مسلمان ایک ہی زبان بولتے تھے، ایک ہی جیسے خدوخال اور شکل و صورت رکھتے تھے، لیکن وہ جرم جس کی قیمت انھیں اپنی جانوں سے چکانا پڑی سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ان کی شناخت اسلام ہے۔ غالباً یہی وہ بنیادی سبب اور سوچ ہے جس کی وجہ سے یورپی یونین، ترکی کو اپنے کلب میں شامل کرنے پر تیار نہیں۔ ترکی کی قیادت نے معاشرے اور ریاست کی سطح پر اپنے آپ کو نفاذ اسلام سے الگ رکھا ہے مگر اس کے باوجود روایتی تعصب، نسلی امتیاز اور مسلمان ہونے کا خوف یورپی یونین کو انھیں قبول کرنے میں مانع ہے۔

مسلمانوں اور اسلام سے متعلق بڑے پیمانے پر پائی جانے والی بدگمانیاں اور معلومات کی کمی، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جاری علمی و ثقافتی "صلیبی جنگ" نہیں ہے تب بھی اسلام اور مغرب کے درمیان

○ ڈائرکٹر جنرل، دعوہ اکیڈمی، اسلام آباد

رابطے کے پل تعمیر کرنے میں ایک بڑی رکاوٹ ضرور ہے۔ یہ بات بہت امید افزا ہے کہ حال ہی میں مغرب کے ہم عصر ماہرین اسلام نے مسلمان اہل علم سے مکالمے کا آغاز کیا ہے تاکہ دونوں برادریوں کے درمیان افہام و تفہیم کے پل تعمیر ہو سکیں (ملاحظہ فرمایئے "The Dialogue of Cultures and Civilizations" دی ڈپلومیٹ، جلد ۲، شمارہ ۴، فروری ۹۷)۔

جب قرآن نے ساتویں صدی میں یہ اعلان کیا تو دراصل یہ سنجیدہ مکالمے کی دعوت تھی:

"اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے" (آل عمرٰن ۳: ۶۴)۔

تاریخ کے بعد کے ادوار میں یہ مکالمہ ثقافتی، سیاسی، معاشی اور سماجی سطح پر جاری رہا۔ یہ اس وقت بھی جاری رہا جب مسلمان اور ان کے مغربی حریف مدمقابل تھے۔ اس کی ایک نمایاں مثال ۷۱۱ تا ۱۴۹۲، سات صدیوں سے زیادہ پر محیط اندلس میں مسلمانوں کا دور حکومت ہے۔

یورپ کے تاریک دور کی روایت کے برعکس، جو "علمی کلچر" مسلمانوں نے متعارف کروایا، پروان چڑھایا اور پھیلایا وہ عقل کی اہمیت، فکر کی آزادی اور علم کی فوقیت پر مبنی تھا۔ حتیٰ کہ سپین میں مسلمانوں کا سیاسی زوال بھی مقامی فن تعمیر، فنون لطیفہ (minor arts) اور سماجی رسوم و رواج میں مسلم ثقافت اور تہذیب و تمدن کے بقا اور تسلسل کو نہ روک سکا۔

جب ۲۹ مئی ۱۴۵۳ کو غازی محمد الفاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو مسلمانوں اور یورپ کے درمیان قریبی تعلقات کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ گو مسلم آبادیوں کے آثار برطانیہ میں قرون وسطیٰ کی بادشاہت تک تلاش کیے گئے ہیں اور مورخین کے پاس شواہد موجود ہیں کہ غالباً ان میں سے کچھ بادشاہ مسلمان تھے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انگریزوں کے بحری بیڑے پر کام کرنے والے بہت سے ملاح صومالی اور یمنی مسلمان تھے۔

مسلمانوں کی نو آبادیاں اٹلی، فرانس، سوئٹزرلینڈ اور سسلی میں بھی موجود تھیں۔ تاریخی اعتبار سے ترک فوجی پروشیا [یورپی ریاست جو ۱۸۷۱ کے بعد یورپ کی جرمن سلطنت کی تشکیل میں ایک بڑی ریاست بن گئی] اور روس کی افواج میں ۱۷۴۵ تک لڑتے رہے۔ ایک مسلم رجمنٹ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۷۷۸ کی بویریائی (Bavarian) [جرمنی کا ایک علاقہ] تخت نشینی کی لڑائی میں حصہ لے چکی ہے۔ ۱۸۰۷ میں نپولین کی فوج کو پروشیا میں مسلمان سپاہیوں کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ ۱۷۹۸ میں جب ترک سفیر کا برلن میں انتقال ہوا تو جرمن بادشاہ نے جرمنی میں پہلا مسلمان قبرستان تعمیر کرنے کے لیے جگہ فراہم کی۔

جنگ عظیم دوم کے بعد کا دور یورپ میں مسلمانوں کے وجود کے ایک نئے رخ کا تعین کرتا ہے۔ ترقی یافتہ یورپ سے ٹکنالوجی سیکھنے کی خواہش، اور دیگر سیاسی اور اقتصادی وجوہات کی بنا پر بہت سے مسلم نوجوان اعلیٰ تعلیم یا بہتر حالات کی خاطر وطن چھوڑ کر ادھر آئے۔ جلد ہی طلبہ اور پیشہ ور ماہرین نے مشرق وسطیٰ کے ممالک پاکستان، ملائیشیا اور کچھ افریقی ممالک سے برطانیہ، جرمنی، فرانس، اٹلی، سکنڈے نیوین ممالک اور دیگر ممالک کا رخ کیا۔ ایک بڑی تعداد میں افرادی قوت نے بھی یورپ کا رخ کیا، بالخصوص ترکی، شمالی افریقہ کے ممالک، بنگلہ دیش، پاکستان اور ویسٹ انڈیز سے۔

بہت سے نئے آزاد ہونے والے مسلم ممالک کی نو آبادیاتی دور کے بعد کی غیر مستحکم سیاسی اور اقتصادی صورت حال بھی مسلم نوجوانوں، پیشہ ور افراد اور دیگر افراد کے لیے مقابلتاً زیادہ جمہوری یورپی ممالک کی طرف رجحان کا ذریعہ بنی۔ سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں آزادی حاصل کرنے والے اکثر مسلم ممالک میں پرانے آقاؤں سے نئے آقاؤں کی طرف اقتدار کی منتقلی نے بھی بہت سے ایسے نوجوانوں کی مایوسی میں اضافہ کیا جو کسی بہتر صورت حال کے لیے تبدیلی کی توقع کر رہے تھے۔ نئے حکمرانوں کی اکثریت اپنے مغربی طرز زندگی کی وجہ سے، ایسے مسلم مفکرین اور پیشہ ور افراد کے لیے دوست ثابت نہ ہوئی جو عالمی سطح پر معروف مفکرین مثلاً سیدابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء-۱۹۷۹ء)، حسن البنا (۱۹۰۵ء-۱۹۴۹ء) اور سید قطب (۱۹۰۳ء-۱۹۶۶ء) کی فکری اور انقلابی تحریروں سے متاثر تھے۔

ان پیشہ ور افراد، نوجوان رہنماؤں اور اشرافیہ نے اپنے آپ کو یونی ورسٹی کی سطح پر اور اسلامک ایسوسی ایشن، تنظیموں، سنٹروں اور تحریکوں کی صورت میں منظم کر لیا۔ ان میں سے اکثر نے یورپ اور امریکہ میں ہی قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا اور مزید اسلامی سرگرمیوں کے لیے مرکز بن گئے۔

آج یورپ میں مسلمان نہ صرف مقامی آبادیوں پر مشتمل ہیں جیسے جرمنی، فرانس، اسپین، اٹلی اور سکنڈے نیوین ممالک میں، بلکہ تارکین وطن کی دوسری اور تیسری نسل کے افراد بھی حق شہریت کی بنا پر جن ممالک میں رہایش پذیر ہیں، ان کی آبادی کا حصہ بن چکے ہیں۔

یورپ میں مسلمانوں کی مقامی آبادیوں کو، غالباً دوسروں کے مقابلے میں، ثقافتی چیلنج کا زیادہ سامنا ہے۔ یورپی ہونے کی حیثیت سے وہ کسی حد تک عیسائی اور سیکولر طرز زندگی کے ان پہلوؤں میں شریک ہیں جن کی عکاسی معاشرے کے تعلیمی، معاشرتی، اقتصادی اور ثقافتی دائرہ اثر میں ہوتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے ہر ممکن اعلیٰ تعلیم حاصل کریں، اپنا معیار زندگی اقتصادی ترقی میں حصہ لے کر بہتر بنائیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ اپنی گھریلو زندگی اسلام کی تعلیمات کے مطابق گزاریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ آس پاس رہنے والوں سے ملیں جلیں اور بات چیت کریں۔

تاہم جب انھیں عیسائی معاشرت کا ایک "معاشرتی حقیقت" کے طور پر احساس ہوتا ہے تو وہ یہ بھی

چاہتے ہیں کہ ان کے نظریات اور طرز زندگی کو بھی تسلیم کیا جائے اور ان کا احترام کیا جائے۔ اگر ایک فرانسیسی' جرمن یا ولندیزی عیسائی لڑکی یہ تصور کرتی ہے کہ اس کا یہ حق ہے کہ وہ سپین کے گرم ساحل سمندر پر غسل آفتابی کرے یا شہر کے معروف حصے میں hot-pants پہن کر گھومے پھرے تو ایک مقامی مسلمان لڑکی بھی یہ چاہتی ہے کہ اس کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ جب وہ سکول جائے یا فیکٹری میں کام کرے تو سکارف پہنے' اور اسے ایک معمول سمجھا جائے۔ اگر معاشرتی اقدار اور رسوم و رواج برہنہ کلب' عریانی و فحاشی کے مظاہروں کی اجازت دیتے ہیں تو پھر جب کچھ شہری لباس اور رہن سہن میں حیا کی روش اختیار کریں تو ان سماجی اقدار کو خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔

ایک ایسے معاشرے میں جس نے لبرل جمہوریت کو "دیوتا" بنا رکھا ہو' مسئلہ صرف مذہبی آزادی پر عمل درآمد تک محدود نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں مسئلہ دراصل "کثرت ثقافت" (cultural plurality) کا ہے' یعنی دوسرے افراد کو ان کی اپنی مرضی کے مطابق طرز زندگی اپنانے کی آزادی دینا۔ ایک وقت تھا جب مغرب میں یہ "ذاتی آزادی" سیکولر اور انفرادیت پسند نظام کا بنیادی ستون تصور کی جاتی تھی۔ اس قسم کے مسائل پر مناسب انداز میں مکالمہ اور گفت و شنید کرنا' ہمارے خیال میں' نہ صرف افہام و تفہیم اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے کلچر کے فروغ میں مفید ثابت ہو گا بلکہ ایک نام نہاد سیکولر دنیا میں اعتدال اور توازن کا باعث بھی ہو گا۔ "کثرت ثقافت" رائج نہ ہو تو عین ممکن ہے کہ سیکولر معاشرہ "بنیاد پرست سیکولر معاشرہ" بن جائے' جہاں سیکولرازم کے ساتھ اندھی عقیدت مندی لوگوں کے لیے مقدس انجیل کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔

چیلنج اور امکانات

اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوئے یورپ میں مسلمانوں کو پانچ بڑے چیلنجوں کا سامنا ہے۔

تعلیمی چیلنج: ان میں پہلا چیلنج' تعلیمی چیلنج ہے۔ تعلیم' انفرادی اور اجتماعی ترقی کے لیے اعلیٰ اقدار کی منتقلی کا ایک حرکی عمل ہے۔ یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک سیکولر اقدار پر مبنی نظام تعلیم الوہی اقدار سے متصف فرد تیار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ایک مکمل سیکولر تعلیم میں' کلاس روم میں چند گھنٹے کی "مذہبی تعلیم" یا "اخلاقی تعلیم" کا باہمی تعامل (interaction) بہ مشکل ہی یکساں سوچ کی حامل جامع شخصیت کو پروان چڑھا سکتا ہے۔ تنہا پسندی' یعنی یہ کہ دوسروں سے سماجی تعلقات کو ختم کرتے ہوئے مسلمانوں کے الگ تعلیمی ادارے قائم کر لیے جائیں' یہ بھی اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔

اسلام نہیں چاہتا کہ اس کے ماننے والے سب سے کٹ کر زندگی گزاریں۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ اس کی آفاقی اخلاقی اقدار میں تمام انسانیت کو شریک کریں۔

مسلم اقلیتوں کو یورپ میں' اپنے لیے' اور دوسروں کے لیے ایک موثر سماجی کردار ادا کرنے کے لیے

نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کا ایک مربوط نصاب تیار کرنا ہو گا۔ ۵۰ سال پرانی حکمت عملی جو مختلف مسلم آبادیوں نے بطور مسلمان اپنی بقا کے لیے اپنائی تھی، تاکہ وہ قرآن مجید کی چند چھوٹی سورتوں کی تلاوت کر سکتے ہوں، نماز پڑھ سکتے ہوں، روزہ رکھ سکتے ہوں، اور فریضہ حج کی ادایگی کے لیے گروپ فلائٹس کا اہتمام کر سکتے ہوں، بلاشبہ نیکی کا کام ہے۔ لیکن قرآن واضح طور پر کہتا ہے:

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں، اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں (البقرہ ۲: ۱۷۷)۔

اس آیت میں صاف اور واضح پیغام ہے۔ یہ عبادات کی نیکی اور عقیدے کو سماجی خدمت کے ساتھ مربوط کر کے بہترین تقویٰ قرار دیتی ہے۔ یہ واضح طور پر بتاتی ہے کہ مسلمانوں کو اگر وہ نیویارک یا برلن یا پیرس میں ہوں، محض خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے سے اطمینان اور مسرت نہیں ہونی چاہیے۔ انھیں، ساتھ ہی ساتھ بھوکوں کو کھانا کھلانے، حاجت مندوں کی مدد کرنے اور وہ لوگ جو سیاسی، معاشی یا ثقافتی لحاظ سے غلام ہیں، انھیں آزاد کرانے کی بھی فکر کرنی چاہیے۔

قرآن و سنت کا یہ جامع نقطہ نظر بھی ایک مربوط نظام تعلیم کو پروان چڑھانے کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے جس میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں اخلاقی تعلیم کے دائرے میں باہم اشتراک کر سکیں۔

یورپ میں مسلمانوں کی بطور اقلیت اپنی بقا کے لیے عام طور پر پائی جانے والی تشویش کو، ترک کر دینا چاہیے۔ ہمارے خیال میں، "بقا" کی اصطلاح، ایک منفی اصطلاح ہے۔ یہ کسی معاشرے کو اخلاقی آداب اور سماجی ذمہ داریوں کی بنیاد پر تعمیر کرنے کی موثر اور مثبت اسلامی فکر کا اظہار نہیں کرتی۔

تعلیم ایک جامع تصور ہے جس میں گھر، سکول، معاشرہ اور ریاست، سب کو ایک ذمہ دارانہ اور اخلاقی کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ یورپ میں مسلمانوں کو ایک تعمیری اور موثر کردار ادا کرنے کے لیے غور کرنا ہو گا کہ اسلام کی آفاقی، اخلاقی تعلیمات کی بنیاد پر تعلیمی اداروں کا قیام کس طرح عمل میں لایا جائے (تفصیلی مطالعے کے لیے ملاحظہ کیجیے: خرم مراد، "Muslim Youth in The West" اسلامک فاؤنڈیشن، لیسٹر، برطانیہ، اشاعت ۱۹۸۶ اور انیس احمد، Value Centric Education System، اسلام آباد، ۱۹۹۶)۔

اسلام کی آفاقی اخلاقی تعلیمات اور آداب مسلمانوں اور غیر مسلم دونوں کے لیے ہیں اور نتیجتاً مسلمانوں اور دوسروں کے درمیان باہمی اشتراک اور افہام و تفہیم کے لیے ایک فطری بنیاد فراہم کرتے

ہیں۔

ذرائع ابلاغ کا چیلنج: دوسرا بڑا چیلنج جس کا یورپ میں مسلمانوں کو سامنا ہے، جو اگرچہ صرف انھی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، ذرائع ابلاغ سے متعلق ہے۔ ذرائع ابلاغ کی ٹکنالوجی میں انقلاب نے براہ راست ہمارے علم، عدل، حسن، انسانیت اور معقولیت کے تصورات کو متاثر کیا ہے۔ جو کچھ ہم اور ہمارے بچے ٹیلی ویژن کی سکرین یا عالمی پیمانے پر وابستہ کمپیوٹر نیٹ ورک پر دیکھتے یا سیکھتے ہیں، وہ ہمارے لیے تعین کرتا ہے کہ کیا حقیقت ہے، کیا سچ ہے یا کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے۔ یا تو ناظرین کو میڈیا کے کنٹرول کے آگے ہتھیار ڈالنا ہوں گے یا پھر انھیں ایک تعمیری سوچ کو پروان چڑھانا اور معلومات اور علم کا وہ تصور دینا ہو گا جس میں اقدار کو مرکزی مقام حاصل ہو۔

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ اسلام کا اخلاقی نظام کسی خاص دائرے تک محدود نہیں ہے۔ جس طرح اسلام عالم گیر ہے، اسی طرح اس کی اقدار تمام انسانیت سے متعلق ہیں۔ مذہب میں اختلاف کے حق کو تسلیم کرتے ہوئے، اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ جان، عزت و آبرو، استدلال اور ملکیت کے حق سے متعلق معاملات میں انسانوں کے درمیان امتیاز روا نہیں رکھنا چاہیے۔ زندگی، استدلال، عزت، مذہبی آزادی اور ملکیت کا حق جنس، رنگ، نسل اور کسی عصبیت کی تمیز سے بالاتر ہو کر ہر ایک کو حاصل ہونا چاہیے۔

جب ان قدروں کو تعلیم اور ذرائع ابلاغ کی بنیاد کی حیثیت سے لیا جائے گا تو اس کے نتیجے میں اخلاقی طور پر ذمہ دار معاشرہ وجود میں آئے گا۔ جب ان آفاقی اقدار کو رد کیا جائے گا اور جائز مقام نہیں دیا جائے گا تو اس کے نتیجے میں نفسا نفسی، انتہا پسندی اور ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے والا معاشرہ وجود میں آئے گا۔ مسلمانوں کو یورپ اور مغرب میں اس چیلنج کا سامنا کرنا ہو گا، اپنی بقا کے لیے نہیں بلکہ ایک صحیح معنوں میں ہوش مند (sane)، منصفانہ اور اصولوں پر مبنی انسانی معاشرے کی تشکیل کے لیے۔

خاندان اور مرد و زن کے تعلق کا چیلنج: تیسرا بڑا چیلنج جس کا مسلمانوں کو مغرب میں سامنا ہے وہ خاندان کا جدید تصور اور مرد و زن کا باہمی تعلق ہے۔ ایک معروف امریکی مسلم دانش ور پروفیسر اسماعیل الفاروقی (۱۹۲۱-۱۹۸۶) نے بجا طور پر نشان دہی کی ہے کہ "اسلامی گھرانہ، اگر یہ صحیح معنوں میں اسلامی ہے، وہ صحیح آئیڈیل ہے جس کی اہل مغرب آج آرزو کرتے ہیں" ('The Path of Dawah in the West یو کے اسلامک مشن، لندن، ۱۹۸۶)۔ انسانیت کے نام اسلام کے پیغام کی ایسے مسلم گھرانے سے اچھی کوئی شکل نہیں جہاں اسلام پر عمل کیا جاتا ہو۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں عیسائی چرچ نے ہم جنس پرستوں کی شادی جائز کر دی ہو، جہاں ایک غیر اخلاقی جنسی انقلاب برپا ہو چکا ہو، جہاں جدید دور کی جنسی اخلاقیات نے قانونی طور پر جائز شادی کو جو میاں اور بیوی کے درمیان اخلاقی اور قانونی معاہدہ ہوتا ہے، اسے کمزور کر دیا ہے اور اس کی خوب تحقیر کی ہے جب کہ ایڈز جیسی مہلک بیماری کی لعنت نہ صرف ان لوگوں کو جو غیر اخلاقی

افعال کرتے ہیں بلکہ ان معصوم جانوں کو بھی جو اس مرض کی اذیت کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں' شکار کر رہی ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لیے اشد ضروری ہے کہ وہ دوسروں کو دیکھنے اور خود تجربہ کرنے کا موقع دیں کہ اخلاقی اصولوں پر مبنی خاندانی زندگی سے کس طرح ایک ایڈز سے پاک' دوستانہ معاشرہ اور ماحول وجود میں آتا ہے۔ اگر مسلم نوجوان جرمنی' برطانیہ' فرانس اور جہاں کہیں بھی ہوں' یونی ورسٹیوں میں اپنی تعلیم کے دوران لڑکیوں سے دوستی لگانے (dating) اور شادی سے قبل جنسی تعلقات قائم کرنے سے باز رہیں تو کیوں ممکن نہیں ہے کہ دوسرے لوگ ایک ایسا معاشرہ جس میں عظمت اور عزت سب کے لیے ہو' تعمیر کرنے میں ساتھ نہ دیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی دنیا میں مسلمانوں کا وجود اور صرف مسلم خاندانی نظام کی تکمیل ہی سماجی اور خاندانی بحرانوں کے حل کے لیے جو کہ سیکولر ثقافتی معاشروں میں مکمل طور پر چھا چکے ہیں' مددگار ہو سکتے ہیں۔

اسلام کی معاشی تعلیمات کا اطلاق: چوتھا چیلنج جو کہ کسی بھی طور پر کم اہم چیلنج نہیں ہے جس کا مغرب میں مسلمانوں کو سامنا ہے' اسلام کی معاشی تعلیمات کے اطلاق سے متعلق ہے۔ اسلام ایک جامع تصور حیات کی حیثیت سے انسان کو درپیش اقتصادی مسائل کا قابل عمل حل پیش کرتا ہے۔ ایک غالب مسلم ریاست کے تناظر میں' اور اس کے ساتھ ساتھ ایسی حالت میں جب مسلمانوں کا معاشی اور سیاسی اداروں میں مکمل طور پر کنٹرول نہ ہو' اقتصادیات' کامرس اور تجارت سے متعلق اسلام کے تصور میں ایک غیر معمولی بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام کے اقتصادی اصولوں کی تکمیل صرف ایک آئیڈیل اسلامی ریاست میں ہی ہو سکتی ہے۔ درحقیقت ایک مکمل اور جامع تبدیلی جیسا کہ اسلام کا تصور ہے' ہر شعبہ زندگی میں اسلامی نظام پر عمل درآمد کے لیے سہولت دیتی ہے۔ لیکن اسلام ایسی صورت حال کے لیے بھی نمونہ پیش کرتا ہے جہاں اسلام غالب نہیں ہے جیسا کہ مکہ میں ہوا' جہاں اسلام کی دعوت کے ابتدائی ۱۳ سال میں اسلام غالب نہ تھا۔

اگرچہ قرآن کے بیشتر سماجی' اقتصادی اور سیاسی احکامات مدینہ منورہ میں نازل ہوئے تھے' مگر مکی دور میں بھی رسول کریمؐ نے ایسے تمام لین دین سے احتراز کیا تھا جو بعد میں قرآن کے ذریعے حرام قرار دیے گئے۔ سیکولر مکہ میں جب وہ مکمل طور پر تجارت اور سماجی سرگرمیوں میں مشغول تھے تو ان کا اخلاقی کردار اتنا واضح تھا کہ اہل مکہ انھیں سب سے زیادہ قابل اعتماد اور سچا شخص پکارتے تھے' جب کہ ان کی مکہ میں موجودگی کو اپنے مروجہ نظام کے لیے ایک خطرہ تصور کرتے تھے۔ ان معاملات میں بہترین اخلاق ہی تھا کہ دشمنوں نے بھی انھیں "الامین" کے لقب سے پکارا۔ یہ بات محتاج بیان نہیں کہ رسول کریمؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کا بہترین کردار مکہ میں اسلامی تحریک کی حقیقی طاقت بن گیا۔ اگرچہ وہ تعداد میں تھوڑے تھے لیکن یہ ان کے اخلاقی برتری اور بلندی کردار کا نتیجہ تھا کہ مسلمان مکہ میں ایک اخلاقی قوت بن گئے۔

مسلمانوں کو یورپ میں، اور کہیں بھی، جلد یا بدیر معاشی ترقی میں حصہ لینے جیسی تعمیری سوچ کے ساتھ معاشی چیلنج کا سامنا کرنا ہو گا۔ انھیں ایک نئی صلح حدیبیہ پر عمل درآمد کرنا ہو گا جس میں استحصال پر مبنی عالمی سودی معیشت سے کوئی سمجھوتہ کیے بغیر، وہ اپنی تجارت اور کامرس میں وہ کاروباری اصول اور کردار جو کہ اسلام کی حرام و حلال کی تعلیمات کے مطابق ہوں، متعارف کروائیں۔ انھیں اپنی معاشی اساس، صاف ستھرے اور سود سے پاک معاشی ترقی کے تصور پر قائم کرنا ہو گی۔ اسلام کے اصول مضاربہ (project finance or venture capital) مشارکہ (اشتراک کاروبار) اور مرابحہ (cost plus) بنیادوں پر سرمایہ کاری) مسلم اکثریت سے یا اس سے ہٹ کر کاروباری معاملات کے لیے مناسب ہیں۔ اسلام میں زکوٰۃ کے ذریعے غریب اور حاجت مندوں کے لیے معاشی کفالت کے انتظام کے تصور کا اطلاق بھی عالمی سطح پر ہوتا ہے۔ مغرب میں مقیم مسلمان یہ سمجھنے میں غلطی پر ہوں گے کہ زکوٰۃ کی بنیاد پر معیشت صرف اسلامی ریاست سے متعلق اور مخصوص ہے۔ بلاشبہ زکوٰۃ سے مکمل طور پر استفادے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ایک اسلامی ریاست قائم کی جائے اور حکومت کی ذمہ داری ہو کہ وہ زکوٰۃ جمع کرے اور تقسیم کرے (الحج ۲۲:۴۱)۔ لیکن زکوٰۃ پانچ وقت کی نماز کی طرح ایک فریضہ ہے۔ چنانچہ جگہ اور وقت کی تبدیلی ایک مسلمان کی زندگی میں اس کی اہمیت اور اطلاق کو بدل نہیں سکتی خواہ وہ فرینکفرٹ، قرطبہ یا اسلام آباد میں رہتا ہو۔

زکوٰۃ بحیثیت عبادت بھی منصفانہ سماجی ترقی کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ ایک مسلمان مرد اور عورت کو مال و دولت کی محبت سے آزاد رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ ایک فرد کو دولت میں دوسروں کو شریک کرنے کی تربیت کرتی ہے اور شعور بخشتی ہے اور دوسروں کو معاشی استحکام دینے اور مفلسی سے بچانے میں مددگار ہوتی ہے۔ فطری طور پر اسلام کی ایسی بنیادی تعلیم کو ایک مسلم آبادی کے سیاسی اقتدار کے حصول تک کے لیے موخر نہیں کیا جا سکتا۔ مسلم آبادی کے لیے یہ ایک قابل غور مسئلہ ہے کہ ایک غیر مسلم ریاست اور معاشرے میں زکوٰۃ کے نظام پر محدود سطح پر کیسے عمل درآمد کیا جائے؟ اس کے عمل درآمد اور نظم و انصرام کے لیے درحقیقت ایک نئی بدلی ہوئی صورت حال میں منصوبہ عمل بنانا ہو گا۔

مخلوط ثقافت کا چیلنج: پانچواں بڑا چیلنج جس کا مسلم آبادیوں کو مغرب میں سامنا ہے لازمی طور پر نتیجہ ہے ثقافتی اثرات کا جو تارکین وطن اپنے آبائی ممالک سے ساتھ لائے ہیں۔ فقہ اور اسلامی قانون کے اطلاق میں اختلاف بعض اوقات مسلم آبادیوں میں تقسیم کا باعث بن جاتا ہے۔ ہماری رائے میں مسلم آبادیوں میں باہمی تعامل، ان اختلافات کو کم کر رہا ہے۔ ہماری خوش گمانی کی ایک بڑی وجہ مسلم نوجوانوں، مردوں اور خواتین میں اپنے آپ کو براہ راست قرآن اور سنت رسول ؐ اللہ سے وابستہ کرنے کا بڑھتا ہوا رجحان ہے۔ علوم کے ان بنیادی مآخذ سے براہ راست استفادہ ایک مومن کو اس بات کو سمجھنے میں مدد دیتا

ہے کہ قرآن و حدیث کے ایک مفہوم اور توجیہہ کو کسی دوسرے پر کیوں فوقیت دی گئی ہے۔ نتیجے کے طور پر یہ اسلامی قانون کے اطلاق کے لیے مختلف معنی اور توجیہات کو برداشت کرنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

اس سمت میں فطری ارتقا کے نتیجے میں یہ آبادیاں اسلامی ماخذ کو اپنے مخصوص تناظر اور حالات میں منطبق کرنے لگیں گی اور غالباً اپنی فقہ کی تدوین کر سکیں گی۔ یہی وہ عمل ہے جس کے نتیجے میں اسلام کی ابتدائی تین صدیوں میں پانچ بڑے فقہی مکاتب فکر کا ارتقا ہوا (ہماری مراد حنفیہ، جعفریہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنبلیہ فقہی مکتب فکر ہیں)۔ ان پانچوں فقہی توجیہات کو علما کی طرف سے نافذ العمل تسلیم کیا گیا۔ اگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک چھٹی فقہی توجیہ سامنے آجاتی ہے تو یہ فطری عمل سے انحراف نہ ہوگا۔

مغرب میں مسلم آبادیاں، ہمارے خیال میں صرف اسی صورت میں ایک موثر اور تعمیری کردار ادا کر سکتی ہیں جب وہ اپنے آپ کو اپنے ہی پر مرکوز (self-centred) نقطۂ نظر سے آزاد کر کے سماجی تعمیر نو کے نقطۂ نظر کو اپنائیں۔ اسلام نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ دوسروں کو بھی امن، سماجی انصاف اور تحفظ کی پیش کش کرتا ہے۔ مسلم آبادیاں عام طور پر اپنے آپ کو "اقلیت" تصور کرتی ہیں اور اکثریت کی طرف مفادات، مراعات اور حقوق کے لیے دیکھتی ہیں، جب کہ قرآن مسلمانوں کو امت وسط (البقرہ ۲: ۱۴۳) قرار دیتا ہے اور مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھیراتا ہے کہ وہ دوسروں تک پہنچ کر اور ان کے سماجی، معاشی اور دیگر مسائل کو حل کر کے معاشرے میں اقدار کی تبدیلی کے ذریعے سماجی تبدیلی لائیں۔ اس لحاظ سے مسلمان خاص نوعیت کی امت ہیں، انسانوں کا ایک ایسا گروہ جن کی کچھ آفاقی، اخلاقی اصولوں سے وابستگی ہے، ان اصولوں کا معاشرے میں نفاذ، ان کی بقا کا اہم مقصد اور غرض ہے۔ لہٰذا مغرب میں مسلمانوں کو یہ سوچنا چاہیے کہ وہ خود ایک سماجی طور پر ذمہ دار معاشرے کے قیام کے ذریعے دوسروں کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

مغرب میں مسلمانوں کی آبادی میں نمایاں اضافہ اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ مسلم آبادی کی نفسیات میں ایسی تبدیلی آنی چاہیے کہ وہ اپنے گردونواح میں عوام کی سطح پر سماجی، معاشی اور تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے اپنا اخلاقی کردار ادا کر سکیں۔ باہر کی دنیا کو دیکھنے والا، حرکی اور اخلاقی نقطۂ نظر مسلمانوں اور دوسروں کے درمیان رابطے کا پل تعمیر کر سکے گا اور مسلمانوں اور اسلام سے متعلق لاکھوں کم باخبر افراد کے درمیان پائی جانے والی اسلام سے متعلق غلط فہمی کو دور کر سکے گا (ترجمہ: امجد عباسی)۔

اخبار امت

عراقی مسلمانوں کی حالت زار

رمزی براوُد

ترجمہ: مسلم سجاد

بغداد کی گلیاں خوانچہ فروشوں اور ٹیکسیوں کے ساتھ ساتھ ایک بے لچک جذبے سے بھی بھری نظر آتی ہیں۔ غیر معمولی افراط زر اور منجمد تنخواہوں کی وجہ سے عراق کے بیشتر محنت کشوں نے اپنی روزی کمانے کے لیے متبادل ذرائع تلاش کر لیے ہیں۔ جب سے مغرب نے عراقی معیشت کو دم گھوٹ کر تباہ کرنے کے لیے پابندیاں لگائی ہیں، افراط زر میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

ایک ٹیکسی ڈرائیور، علی جو سابق فوجی ہے، ۱۵ گھنٹے روزانہ ٹیکسی چلا کر اپنے دس افراد کے خاندان کو سہارا دیتا ہے۔ اس نے مجھے اپنے سر پر لگے ہوئے گولیوں کے دو نشان دکھائے۔ حکومت نے اسے فوج سے فارغ کر دیا اور ۵۷۵ عراقی دینار ماہانہ پنشن مقرر کی۔ ایک وقت تھا کہ اس سے علی کی تمام ضروریات پوری ہو جاتی تھیں اور کچھ رقم بچتی بھی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ اب میں یہ پیسے لینے جاتا بھی نہیں۔ آنے جانے کا خرچ اور وہاں کا انتظار اس سے زیادہ مہنگا پڑتا ہے۔

پابندیوں سے قبل عراقی دینار ۳.۳ امریکی ڈالر کے برابر تھا۔ اب ایک امریکی ڈالر ۱۹۷۵ دینار کے برابر ہے۔ ایک معمولی عام ہوٹل میں چائے کا کپ ۲۵۰ دینار میں ملتا ہے، یعنی علی کی نصف ماہانہ پنشن کے برابر۔

ایک مقامی صراف کو میں نے ۲۵ ڈالر دیے۔ اس نے مجھے دینے کے لیے ۵۰ ہزار دینار گنے تو میں پریشان سا ہو گیا۔ میں اپنے بیگ میں ان نوٹوں کو بمشکل رکھ سکا۔ کلرک نے ہنستے ہوئے کہا کہ انھیں گن لیں۔ میں نے بھی ہنستے ہوئے جواب دیا: "کوئی بات نہیں، انھیں گننے کے لیے میرے پاس پورا دن نہیں ہے"۔ باہر نکلتے ہوئے میں نے ۲۵ دینار کا عراقی نوٹ زمین پر پڑا دیکھا۔ گزرنے والے حتیٰ کہ بچے بھی اسے

نظرانداز کر رہے تھے۔ اس کی کوئی قیمت نہ تھی۔

وہ عراقی خوش قسمت ہیں جنھوں نے ابھی تک اپنے اثاثے فروخت نہیں کیے۔ کم خوش قسمت' اپنی تقریباً ہر چیز بیچ چکے ہیں۔ پابندیوں کے ابتدائی دنوں میں' ٹیلی وژن اور اسٹریو فروخت ہوئے' پھر فرنیچر کی باری آئی۔ پابندیوں کے ہر مرحلے میں کچھ خاص قسم کی اشیا عراق کی سڑکوں پر فروخت کے لیے آتی رہیں۔ اب لوگ اتنے پریشان ہیں کہ اپنی کتابیں اور کپڑے بھی بیچ رہے ہیں۔

المتنبی اسٹریٹ پر ہر طرح کی کتابیں فروخت ہو رہی ہیں۔ پرانی کتابیں' رسالے' سبھی چیزیں موجود ہیں۔ خریدنے والوں سے زیادہ بیچنے والے ہیں۔ جارج بش کا عراق کو پتھروں کے عہد تک پہنچانے کا وعدہ حقیقت سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔

۸۰ کے عشرے کے اواخر میں' عراق نے ۵۰ لاکھ تارکین وطن کو خوش آمدید کہا اور ان کو ملازمتیں فراہم کیں۔ اب عراق کے پاس اپنی آبادی کے لیے بھی روزگار نہیں ہے بلکہ خوراک بھی نہیں ہے۔ بڑے شہروں میں بے روزگاری کی شرح ریکارڈ سطح تک پہنچ گئی ہے۔ مڈل ایسٹ کونسل آف چرچ کے سربراہ مائیکل نل کے مطابق' عراق کی دو تہائی افرادی قوت (work force) غیرپیداآور ہے۔ اس کی وجہ سستی و کاہلی نہیں بلکہ کام کرنے کے لیے وسائل کا نہ ہونا ہے۔ خام مواد' سرمایہ اور نقل و حمل کے نہ ہونے کی صورت میں عراقی معیشت کے لیے نیچے جانے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔

بغداد میں زیادہ تر یونی ورسٹی گریجوایٹ ٹیکسیاں چلا رہے ہیں۔ لیکن علم کی پیاس ہے' اس لیے عراق کے کالج اور اسکول کھلے ہوئے ہیں۔ نوجوانوں کے چہروں پر امید ہی امید نظر آتی ہے۔ عراقیوں کے پاس ایمان کے علاوہ ہر چیز کی کمی ہے۔ جب بھی آپ کسی سے پوچھیں کہ تم اس سب کے ساتھ کیسے گزارا کر رہے ہو تو ہر دفعہ سب کی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔

بغداد کے ٹیکسی ڈرائیور حامد سے جو پولٹیکل سائنس میں ایم اے ہے' میں نے پوچھا کہ تمھارے خیال سے اس شہر کا مستقبل کیا ہے؟ اس کا جواب ایک نمایاں مسکراہٹ تھی! ایک ثانیے کے لیے میں اس کی اہمیت محسوس نہ کر سکا۔

جب ہم دریاے دجلہ پر پل آزادی سے گزرے تو اس نے کہا کہ امریکہ سے جنگ کے دوران اس پل پر تین دفعہ بمباری ہوئی۔ یہ کئی حصوں میں ٹوٹ کر دریا میں گر گیا۔ ہم نے انتہائی محدود ذرائع سے اس کو بہت جلدی تعمیر کر لیا۔ اس نے زور دے کر کہا: "دیکھو' یہ پہلے سے اچھا نہیں ہے؟" میں نے دریاے دجلہ پر فخر اور وقار کے ساتھ کھڑے اس عظیم الشان پل کو دیکھا' تب میں سمجھا---!

صدام ٹیچنگ ہسپتال میں ڈاکٹر جسیم محمد نے افسوس کے ساتھ کہا: "ہمارے پاس کچھ نہیں ہے"۔ اس نے ہسپتال کے بھرے ہوئے کمروں اور برآمدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ تو ایک ہسپتال بھی

نہیں لگتا' یہ تو ایک پرانے اور گندے مکان کی طرح ہے۔ پیسہ نہیں ہے۔ مریض ایک دوسرے کے اوپر سو رہے ہیں۔ لوگ یہاں صحت نہیں موت حاصل کرنے آتے ہیں"۔

ڈاکٹر جسیم کے ساتھ ہم بچوں کے اس ہسپتال کی تیسری منزل تک خاموشی سے چلتے ہوئے پہنچے جہاں زیادہ تر بیمار بچے تھے۔ تعفن زدہ فضا نے ہمارا استقبال کیا۔ جب میں بڑے کمرے میں داخل ہوا جہاں ۱۵ بچے موت و زیست کی کش مکش میں مبتلا تھے تو مجھے بو کی اہمیت کا کوئی احساس نہ رہا۔

صوبہ الرمادی کا سات سالہ لڑکا' رائید محمد کے قریب جب میں گیا تو وہ مجھے شرمیلا سا لگا۔ اس کے چہرے پر موجود معصومیت نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کیا اسے معلوم ہے کہ اس کے ننھے سینے میں سرطان کا پھوڑا ہے؟ کیا وہ یہ بھی جانتا ہے کہ سرطان کیا ہوتا ہے؟ رائید خون تھوکتا ہے لیکن اسے اپنی بیماری کے مطابق مناسب علاج کی سہولت اور دوا میسر نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے جب مجھ سے انگریزی میں کہا: چند دنوں کی بات ہے یہ چلا جائے گا--- تو رائید ہمیں دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی پوچھا: کہاں چلا جائے گا؟ اس نے اپنے آنسو روکتے ہوئے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: "ہسپتال کے اس حصے میں آکر جہاں سب بچے چلے جاتے ہیں۔ وہ سب موت سے ہم کنار ہو جاتے ہیں!"

ہاجرہ عبداللہ ہم سے گفتگو کے لیے اپنی باری کے انتظار میں بڑی بے چین نظر آ رہی تھی۔ لیکن جیسے ہی میں نے اس سے اس کا نام پوچھا وہ شرما کر رہ گئی۔ وہ چار ماہ سے خون کی کمی کا شکار' زیر علاج تھی۔ اس کے قریب رکھی ہوئی سبز خالی میز گواہی دے رہی تھی کہ اسے کتنا علاج میسر ہے۔

میں نے ڈاکٹر معاذن سے پوچھا کہ ہسپتال مریضوں کو کیا فراہم کرتا ہے؟ اس نے بتایا کہ ہم جگہ دیتے ہیں اور دوائیں' اگر اس کے خاندان والے بلیک مارکیٹ سے خرید کر لا سکیں تو....! بچوں کی مائیں بطور نرس کام کرتی ہیں۔ وہ غذا لاتی ہیں اور لا سکیں تو دوائیں۔ جو مائیں دوا نہیں خرید سکتیں' اپنے پیارے بچوں کے پاس دن رات بیٹھی رہتی ہیں۔ وہ دیکھتی ہیں کہ ان کے جسم ڈھلکے ہوئے ہیں' ان کے لیے دعائیں کرتی ہیں' انھیں لوریاں دیتی ہیں' تا آنکہ بچے مرجاتے ہیں۔

جن ماؤں سے میری ملاقات ہوئی' ان میں سے ایک بغداد کی فرح تھی۔ فرح کی چار سالہ بیٹی علاہ کو گردن توڑ بخار ہے۔ کئی ماہ سے وہ ہسپتال میں ہے لیکن علاج کے لیے وسائل نہیں۔ جس وقت میں اس کے والدین سے ملنے کے لیے اس کی طرف جا رہا تھا' ایک چیخ اور پھر رونے کی آوازیں سن کر میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ علاہ کا انتقال ہو گیا تھا!

خوب صورت سرخ لباس میں ملبوس' کھلی آنکھوں کے ساتھ علاہ ایک چھوٹے بستر پر لیٹی ہوئی تھی' جب کہ اس کے گھر والے چاروں طرف بے بسی سے رو رہے تھے۔ علاہ کے دادا نے مجھ سے کہا کہ اس کی تصویریں لو۔ وہ کہہ رہا تھا کہ دنیا کو بتاؤ کہ ہمارے بچوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ دنیا کو بتاؤ کہ پابندیوں نے

ہمارا کیا حشر کر دیا ہے؟ اس نے علاء کا برتھ سرٹیفکیٹ ہاتھ میں اٹھایا اور چیخ کر کہا: "انھوں نے اسے قتل کر دیا۔ امریکہ خوش ہے۔ اب وہ خوش ہو لیں۔ اب وہ جشن منا لیں۔ انھوں نے علاء کو قتل کر دیا۔ انھوں نے میری اکلوتی پوتی کو قتل کر دیا"۔

ڈاکٹر محمد نے جو ۱۹۹۵ میں گریجوایشن کے بعد سے اسی ہسپتال میں کام کر رہے ہیں' مجھے بتایا: "جب کوئی بچہ مرتا تھا تو میں ہر مرتبہ روتا تھا۔ میں ان میں سے ہر ایک کا دوست ہوتا تھا۔ اب میں یہ نہیں کر سکتا۔ یا پھر مجھے روزانہ تین یا تین سے زیادہ دوستوں کا ماتم کرنا ہو گا"۔ جب بغداد کے سب سے بڑے ہسپتال کا یہ حال ہے تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ چھوٹے ہسپتال کس طرح کام چلا رہے ہوں گے۔ جواب یہ ہے: "وہ کام نہیں چلا پا رہے۔ اسی لیے روزانہ بچوں کی بہت بڑی تعداد مر جاتی ہے"۔

ہسپتال کے دروازے کے پاس ایک آدمی اپنی جیکٹ بچھائے نماز پڑھ رہا تھا۔ جب میں اس کے قریب گیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ خون کے سرطان سے مرنے والے ایک بچے کا باپ تھا۔ ہسپتال سے آنے کے بہت دیر بعد تک اس کی آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ اللہ اکبر... اللہ اکبر! (کریسنٹ انٹرنیشنل' ۱۶ تا ۳۱ مئی' ۱۹۹۹ سے ماخوذ)۔

مراکش: مسائل کا شکار

مسلم سجاد

مراکش امت مسلمہ کا ایک اہم ملک ہے جہاں کے بارے میں ہمارے ذرائع ابلاغ میں کبھی کبھار ہی کوئی خبر آتی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ وہاں کے ہمارے مسلمان بھائی کس طرح کی زندگی گزار رہے ہیں اور کن مسائل کا شکار ہیں۔

مراکش میں گذشتہ سال انتخابات کے بعد شاہ حسن نے حکومت بائیں بازو کی پارٹیوں کے حوالے کی۔ سوشلسٹ لیگ آف پیپلز فورسز (USFP) کے عبدالرحمٰن یوسفی وزیراعظم بنے۔ دوسرے مسلمان ملکوں کی طرح یہاں بھی سیاسی مخالفت برداشت نہ کرنے کی روایت رہی ہے۔ نئی حکومت آنے کے بعد توقع تھی کہ ماضی کے ظلم و جبر کا کچھ ازالہ کیا جائے گا۔ عبدالرحمٰن یوسفی کی حکومت کو ایک سال ہو چکا ہے۔ لیکن اس حکومت سے جو توقعات قائم کی گئی تھیں' بیشتر پوری نہیں ہوئی ہیں۔ بعض پولیس افسران کو قتل' ٹارچر اور عصمت دری کے الزام میں سزائیں ہوئی ہیں۔ کچھ ججوں کو بھی تنبیہہ کی گئی ہے لیکن محسوس کیا جا رہا ہے کہ حکومت سابق دور کے لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بجائے' ان سے مکالمے اور سمجھوتے کی راہ پر چل پڑی ہے۔ لوگ حیران ہیں کہ ان کی تحسین بھی کی جا رہی ہے۔

شاہ حسن نے ۱۹۶۰ سے ۱۹۷۹ کے دوران لاپتہ ہونے والے ۱۱۲ میں سے ۵۶/ افراد کا معاوضہ دینے پر اور ۲۰ سیاسی مخالفین کی رہائی پر رضامندی ظاہر کی ہے۔ اس کے لیے مذاکرات مراکش کی حقوق انسانی کونسل نے کیے، لیکن اس کونسل نے بھی دو اہم افراد کے بارے میں بات نہیں کی: اسلامی رہنما عبدالسلام یٰسین جو ۱۹۸۹ میں گرفتاری کے بعد سے گھر میں نظربند ہیں اور ابراہیم سرفتی، جنھیں ۱۷ برس جیل میں رکھ کر ۱۹۹۱ میں فرانس ملک بدر کیا گیا۔

بیسویں صدی کا اختتام ہے، دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے لیکن مراکش میں ابھی خواندگی کی شرح ۵۰ فی صد ہے۔ دیہی علاقوں میں ۹۰ فی صد بچے اسکول نہیں جاتے، ۶۳ فی صد آبادی کو گھر پر پانی میسر نہیں ہے، ۸۳ فی صد بجلی سے محروم ہے، ۹۳ فی صد کے لیے نکاسی آب کا انتظام نہیں ہے۔ آبادی کے ۱۰ فی صد انتہائی غربت کی زندگی گزارتے ہیں۔ افرادی قوت کے ۱۹ فی صد بے روزگار ہیں۔ امیر اور غریب کی آمدنی کا تفاوت غیر معمولی ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس صورت حال کو بہتر کرنے کے لیے کوئی منصوبے زیر عمل نہیں ہیں، بس چند نمایشی اقدامات کیے گئے ہیں۔

جو کچھ معاشی ترقی ہوئی ہے اس کے فوائد نچلی سطح تک نہیں پہنچ پائے۔ گذشتہ سال بھی ہزاروں مراکشیوں نے جبرالٹر کو عبور کر کے یورپ جانے کی کوشش کی۔ ۱۵۰ ڈوب گئے، ۱۵۰۰ گرفتار ہوئے۔

بے روزگار گریجوایٹ احتجاج کرتے رہتے ہیں۔ نئی نسل کو، بادشاہ سے کسی تبدیلی کی توقع نہیں ہے۔ اسلامی قوتوں کو سیاسی تحریک کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جاتا لیکن وہ نمایاں سیاسی اور اجتماعی قوت کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آ رہی ہیں (ماخوذ: ماہنامہ امپیکٹ، لندن، مئی ۱۹۹۹)۔

شیخ عبدالعزیز بن بازؒ

علم و تقویٰ کا حسین امتزاج

حافظ محمد ادریس

ماہ محرم کی ۲۶ تاریخ کو مشرق و مغرب کے ذرائع ابلاغ نے ایک نہایت اندوہ ناک خبر سنائی۔ اس خبر نے پورے عالم اسلام میں اداسی پھیلا دی۔ ۲۶ محرم ۱۴۲۰ھ' ۱۳ مئی ۱۹۹۹ء جمعرات کے دن دنیاے اسلام کے عظیم عالم دین اور سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ ابو عبداللہ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں ریاض میں انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلیہ راجعون!

شیخ بن باز کی ساتویں پشت میں ان کے جد امجد کا نام باز تھا۔ انھی کی وجہ سے یہ خاندان آل باز کہلاتا ہے اور شیخ عبدالعزیز ان کی نسبت سے شیخ بن باز معروف ہو گئے تھے۔ شیخ مرحوم پوری دنیا میں معروف اور عالم عرب میں مقبول عالم دین تھے۔ ان کی وفات سے علمی حلقوں میں بہت بڑا خلا پیدا ہوا ہے جس کا پر ہونا بہت مشکل ہے۔ شیخ بن باز ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۱ء) میں ریاض میں ایک معمولی زراعت پیشہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ ۱۳۴۶ھ میں آشوب چشم کی بیماری میں مبتلا ہوئے۔ مقامی طبیبوں سے علاج کروایا مگر افاقہ نہ ہوا۔ ان کی آنکھیں خاصی خراب ہو گئیں۔ چار سال کا طویل عرصہ وہ اس تکلیف میں مبتلا رہے۔ اس کے بعد ۱۳۵۰ھ میں ان کی دونوں آنکھوں کی بینائی مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ یہ ایک بہت بڑا سانحہ تھا جس سے یہ نوجوان عالم دین دوچار ہوئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اپنے اس فیصلے میں ایسی مصلحت اور حکمت پنہاں رکھی ہوئی تھی کہ آنکھوں کی بینائی زائل ہو جانے کے بعد اس نے ان پر اپنی نعمتوں کے دروازے کھول دیے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی حصول علم اور اسے دوسرے لوگوں تک پہنچانے اور پھیلانے کے لیے وقف کر دی اور بلاشبہ اس کا حق ادا کیا۔ سعودی عرب جو آج کل طبی سہولتوں کے لحاظ سے ترقی یافتہ ممالک میں شمار ہوتا ہے' تیل کی دریافت سے قبل اور تیل کی دریافت کے بعد ابتدائی سالوں میں جدید طبی سہولتوں سے بالکل محروم تھا۔ شیخ کے علاوہ بھی ان کے ہم عصر بہت سے علما اور معروف سعودی شخصیات اسی نوعیت کی بیماری میں مبتلا ہو کر بینائی سے محروم ہو گئی تھیں۔

شیخ عبدالعزیز بن باز بلا کے ذہین اور غیر معمولی حافظے کے مالک تھے۔ اللہ نے انھیں ایسی صلاحیتیں عطا

کی تھیں کہ اگر انھیں نابغہ روزگار کہیں تو بے جا نہ ہو گا۔ ابتدائی عمر میں ہی انھوں نے قرآن پاک حفظ کر لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ حصول علم کے لیے ریاض اور نجد کے دوسرے علاقوں میں علما کے پاس حاضر ہو کر اپنی پیاس بجھانے لگے تھے۔ شیخ نے حجاز مقدس میں مکہ اور مدینہ کے علما سے بھی اکتساب علم کیا۔ ان کے اساتذہ جید علماے دین تھے اور بن باز کے شوق علم کے مداح تھے۔ شیخ عبدالعزیز بن باز نے تجوید سیکھنے کے لیے خصوصی طور پر مکہ مکرمہ کے معروف عالم دین اور قاری شیخ سعد بن وقاص بخاری سے ۱۳۵۵ھ میں کئی مہینوں تک تعلیم حاصل کی اور تجوید کے رموز و معارف سیکھے۔ مجھے شیخ سے تلاوت قرآن سننے کا شرف حاصل ہوا۔ شیخ کا لب و لہجہ نجدی تھا مگر ان کی تلاوت میں بہت درد اور سوز و گداز پایا جاتا تھا۔ بسااوقات یوں معلوم ہوتا تھا کہ تلاوت کرتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی ہے اور ان کا دل خشیت الٰہی سے لرز رہا ہے۔ یہ علماے ربانی کی خاص علامت ہے جو آج کے دور میں خال خال نظر آتی ہے۔

شیخ عبدالعزیز بن باز ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے ایک عام سے انسان نظر آتے تھے اور خاندانی لحاظ سے بھی وہ سعودی عرب کے کسی بڑے خاندان سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے علمی مقام و مرتبے کا یہ عالم تھا کہ سعودی عرب میں شاہی خاندان اور آل شیخ کے بعد جس شخص کو سب سے زیادہ شہرت اور عزت کا مقام ملا وہ شیخ بن باز ہی تھے۔ تعلیم' سماجی و معاشرتی اصلاحات اور خدمات اسلامیہ کے میدان میں کوئی بڑا ادارہ ایسا نہیں تھا جس کی سربراہی شیخ بن باز کے حصے میں نہ آئی ہو۔ رابطہ عالم اسلامی سے لے کر دارالافتاء والارشاد تک اور عالمی مساجد کونسل سے لے کر مدینہ کی اسلامی یونی ورسٹی تک' کبار علما کی مجلس سے لے کر مفتی اعظم کے اعلیٰ عہدے تک' سبھی اداروں کے سربراہ کے مناصب پر وہ فائز رہے مگر ان کا عجز و انکسار اور تواضع کا معمول ہمیشہ قائم رہا۔

بعض معاملات میں وہ منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ جب سعودی عرب میں روپے کی ریل پیل شروع ہوئی اور اس کے ساتھ میڈیا میں تفریح کے نام پر عریانی اور فحاشی نے رنگ دکھانا شروع کیا تو شیخ نے اس پر احتجاج کیا۔ شاہی خاندان ہمہ مقتدر ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے علما کی آرا کو بعض معاملات میں وزن بھی دیتا ہے مگر ظاہر ہے کہ انتظامی اور حکومتی فیصلوں میں علما کی رائے ایک حد تک ہی قبول کی جاتی ہے۔ شیخ کی بات جب نہ مانی گئی تو شیخ نے احتجاج کیا اور اس کے اظہار کے لیے کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر چلے گئے۔ یہ دور انھوں نے زیادہ تر کویت میں گزارا مگر شاہی خاندان کے ذمہ داران نے ان سے اپنے نمایندوں کے ذریعے رابطہ رکھا اور بات چیت کے ذریعے انھیں واپس وطن لے آئے۔ اس واقعے کا ذکر شیخ کے تذکرہ نگار عموماً اپنی تحریروں میں نہیں کرتے مگر یہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اہم واقعہ ہے۔ اپنے دور شباب میں شیخ نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ احتجاجی اقدام کیا مگر وہ ایک فرد واحد تھے اور وہ بھی آنکھوں سے معذور' کوئی طویل جدوجہد نہیں کر سکتے تھے۔ بالآخر انھوں نے حکومت کی کچھ یقین دہانی کے

بعد وطن واپس آنا اور مختلف مناصب پر کام کرنا قبول کر لیا۔ اس کے باوجود شیخ کے اس اقدام نے ان کی دھاک بٹھا دی جس کا بعد میں انھیں فائدہ بھی ہوا۔ وقتاً فوقتاً شیخ اپنے فتاویٰ میں میڈیا پر تنقید بھی کرتے رہے۔ ان کا نقطۂ نظر آخر میں یہ ہو گیا تھا کہ حکومت کے قریب رہ کر نصیحت کرتے رہنا چاہیے۔ کسی حد تک یہ موقف بعض لوگوں کے نزدیک درست بھی ہے اس لیے کہ کوئی بھی انسان اللہ تبارک و تعالیٰ کے ہاں اسی حد تک مکلف ہے جس حد تک اس کے پاس ذرائع اور قوت ہو۔ اپنی قوت سے زائد کا وہ مکلف نہیں ٹھیرایا گیا۔ تاہم جن ممالک اور معاشروں میں تنظیم سازی، جمہوری جدوجہد اور عوامی تحریک اٹھانے کے مواقع موجود ہوں ان کا موازنہ شخصی حکومتوں اور بادشاہتوں سے مناسب نہیں۔

شیخ عبدالعزیز بن باز اپنے فتاویٰ میں کھری بات کہا کرتے تھے۔ حنبلی المسلک ہونے کے باوجود چونکہ خود مجتہد تھے، قرآن و سنت پر ان کی بڑی گہری نظر تھی اور تمام مآخذ انھیں مستحضر تھے اس لیے اپنی رائے اور فتویٰ فقہی مسالک کی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر دیتے تھے۔ کئی معاملات میں دیگر ائمہ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے حنبلی فقہا کی رائے کے خلاف بھی انھوں نے فتوے دیے ہیں، جو ان کی فتاویٰ کی کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے فتاویٰ درجن بھر جلدوں میں مرتب ہو چکے ہیں اور بے شمار فتاویٰ ابھی ایسے ہیں جو کتابی صورت میں آنے باقی ہیں۔ ان فتاویٰ میں تکرار بھی ہے اور جدید مسائل اور سیاسی موضوعات کے بارے میں ان کی بعض آرا میں کچھ ضعف بھی ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے ہمیشہ جو بات بھی کہی اس کو پورے یقین اور حزم کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

شیخ مرحوم، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی طرح بہت وسیع الظرف اور علمی میدان میں تحقیق اور مجتہدانہ کاوش کے قائل تھے اور اس اصول پر کاربند بھی کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوتا۔ البتہ ہر مدعی علم کا یہ منصب نہیں کہ وہ اجتہادی فیصلے صادر کرنا شروع کر دے۔ اجتہاد کے لیے سلف صالحین نے جو بنیادی اصول اور قابلیت کے ضابطے مقرر کیے تھے ان کی موجودگی ہی میں اجتہاد معتبر و مستند قرار پا سکتا ہے۔ شیخ بن بازؒ اور سید مودودیؒ دونوں بزرگ، اجتہاد کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کاوشوں کو شرف قبولیت بخشے۔

شیخ عبدالعزیز بن باز کی بہت ساری خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ تھی کہ وہ بہت مہمان نواز تھے۔ ان کے ہاں جو کوئی بھی چلا جاتا بلاتخصیص ان کے دستر خوان پر ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتا تھا۔ ان کا دستر خوان وسیع بھی تھا اور سادہ بھی۔ جو کوئی ان سے ملاقات کے لیے چلا جاتا اس سے تعارف کے بعد شیخ اسے اپنے ہاں کھانے کی دعوت ضرور دیتے۔ شیخ عبدالعزیز بن باز جب مکہ میں مقیم تھے تو انھوں نے اپنی اس رائے کے عین مطابق ذاتی طور پر عمل کر کے دکھایا کہ مکہ کے گھروں میں زائرین جب بھی آ جائیں اور جہاں بھی آ جائیں اور گنجایش موجود ہو تو انھیں بلامعاوضہ جگہ فراہم کرنی چاہیے۔ اس موضوع پر علما کے

درمیان بڑی بحثیں ہوئیں مگر شیخ بن باز نے اس میں کسی قسم کی مداہنت سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے محض فتویٰ دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے اس فتویٰ پر عمل کر کے یہ ثابت کیا کہ وہ اپنی ہر بات میں مخلص اور اپنے قول و فعل میں مکمل مماثلت رکھنے والے عالم ربانی ہیں۔

شیخ عبدالعزیزؒ بن باز جن دنوں اسلامی یونی ورسٹی مدینہ میں وائس چانسلر تھے' مجھے ان کی خدمت میں دو مرتبہ حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس منصب سے ان کی فراغت کے بعد ایک مرتبہ مکہ معظمہ میں اور ایک مرتبہ ریاض میں بھی ان کے ہاں حاضری کا اعزاز ملا۔ مدینہ منورہ میں' میں جب شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا' تو اسلامک فاؤنڈیشن نیروبی کے ڈائریکٹر اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے نمایندے کی حیثیت سے ان سے ملاقات کی۔ شیخ اپنی روایتی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ بہت محبت کا اظہار کیا اور سید مودودیؒ کے بارے میں بہت اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ افریقہ میں ہمارے دعوتی و تعلیمی کام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں بڑی دلچسپی لی جس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ افریقی ممالک میں شیخ کے جو مختلف شاگرد تعلیمی و تبلیغی خدمات سرانجام دے رہے تھے' ان کا حال احوال بھی پوچھتے رہے۔ مجھے اس بات پر خوش گوار حیرت ہوئی کہ شیخ کو اپنے شاگردوں کے نام تک یاد تھے۔

شیخ کے شاگردوں اور عقیدت مندوں میں عرب دنیا کے علاوہ افریقہ' برعظیم پاک و ہند' مشرق بعید' یورپ اور چین تک کے باشندگان شامل تھے۔ حنفی' شافعی' مالکی' حنبلی' سلفی سبھی شیخ کو یکساں عزیز تھے۔ یہ ان کی عظمت کی دلیل تھی۔ شیخ کی مجلس میں ایک عجیب علمی اور روحانی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ اپنے دفتر میں بیٹھے ہوتے تو بھی اس قدر فعال اور بیدار مغز کہ بہ یک وقت کئی معاملات کو نپٹا رہے ہوتے۔ میں نے کئی مرتبہ دیکھا کہ دو تین سیکرٹری ان کے پاس موجود ہوتے۔ ایک کو کسی ایک موضوع پر املا لکھوا رہے ہیں تو دوسرے کو کسی اور موضوع کے بارے میں ہدایات دے کر فارغ کر رہے ہیں۔ اسی دوران میں کوئی زائر آگیا ہے تو اس سے حال احوال بھی پوچھ رہے ہیں' اور اس کے سوالوں کے جواب بھی دے رہے ہیں۔ ٹیلی فون آگیا تو کسی نے یہ نہیں کہا کہ شیخ اس وقت مصروف ہیں' بعد میں ٹیلی فون کر لیں' بلکہ اسی وقت شیخ سے بات کروائی گئی' اور شیخ نے سائل کو اس کے سوال کا سیر حاصل جواب دیا۔ کسی لمحے یہ احساس نہ ہوتا تھا کہ شیخ اکتا گئے ہیں یا بوریت محسوس کر رہے ہیں۔ ان کو اللہ نے بڑا حوصلہ اور ظرف عطا کیا تھا۔

عجیب بات یہ ہے کہ اتنی مصروفیات کے باوجود وہ اتنا علمی ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے کہ آنکھوں والے بھی رشک کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شیخ کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ جو بات بھی کریں اور کسی بھی موضوع کے بارے میں کسی بھی سوال کا جواب دیں' تو اسے ریکارڈ میں آنا چاہیے۔ چنانچہ شیخ کی کم و بیش تمام باتیں تحریر یا کیسٹ کی صورت میں محفوظ ہوتی رہیں اور انھی چیزوں کو بعد میں مرتب کیا گیا۔ مجھے شیخ کے خطاب بھی سننے کا اتفاق ہوا۔ وہ بہت پروقار علمی انداز میں گفتگو فرماتے تھے۔

شیخ عبدالعزیز بن باز عالم اسلام کے تمام معاملات پر نظر رکھتے تھے اور اخباروں کی خبریں' ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے تبصرے اور مختلف جانب سے آنے والی تازہ ترین (up date) معلومات اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے۔ آنکھوں کی بینائی سے محروم ہونے کے بعد شیخ اکثر اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرتے تھے کہ اے پروردگار' تو نے مجھے آنکھوں کی بصارت سے محروم کیا ہے تو مجھے بصیرت سے دافر حصہ عطا فرما اور تو نے دنیا میں مجھے ایک نعمت سے محروم کر دیا ہے تو آخرت میں مجھے اس کے بدلے میں اپنی رضا کی صورت میں اجر عطا فرما۔ شیخ کی یہ دونوں دعائیں مقبول نظر آتی ہیں۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسی بصیرت عطا فرمائی کہ جس پر آنکھوں والے بھی رشک کرتے ہیں اور ان کا عمومی طرز عمل جس میں عجز و انکسار بھی تھا' للہیت اور تقویٰ بھی' خشیت خالق اور حب خلق بھی بدرجہ اتم موجود تھی' آخرت کی کامیابی کی ضمانت معلوم ہوتی ہے۔

شیخ' عالم اسلام کے مختلف معاملات میں نہ صرف دلچسپی لیتے تھے بلکہ ان پر اظہار خیال بھی کرتے تھے۔ دنیا میں مسلمانوں پر کہیں ظلم ہو رہا ہو' وہ فوراً اس پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے جو عرب دنیا میں بھرپور انداز میں اور مشرقی اور مغربی دنیا میں بھی کافی حد تک میڈیا کے ذریعے سے نشر ہو جاتا۔ حالیہ دور میں فلسطین کے مسئلے پر بعض عرب سربراہوں اور دانش وروں نے جو کمزور رویہ اختیار کیا اور غاصب صیہونیوں کے متعلق سابقہ سخت پالیسی میں نرمی آگئی تو خیال یہ تھا کہ شیخ اپنی روایت اور افتاد طبع کے مطابق اپنے سخت رویے کو ترک نہیں کریں گے۔ مگر شیخ نے بعض مصالح کے پیش نظر اس میں کچھ نرمی اختیار کی جس پر شیخ عبدالعزیز بن باز اور معروف دانش ور اور عالم دین شیخ یوسف القرضاوی کے درمیان اختلاف رائے ہوا اور یہ اختلاف رائے عربی اخبارات اور میڈیا کے ذریعے عام قارئین تک بھی پہنچا۔ مگر اس کے باوجود ان دونوں بزرگوں کا کمال ہے کہ باہمی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ایک دوسرے سے رابطہ اور نیک تمناؤں کا تبادلہ جاری رہا۔ اس کا ذکر شیخ یوسف القرضاوی نے کویت سے شائع ہونے والے عربی مجلے المجتمع میں اپنے تعزیتی مضمون میں بھی کیا ہے۔ علماے ربانیین اور اہل حق کا یہ ہمیشہ سے شیوہ رہا ہے کہ وہ اختلاف رائے کو بنیادی حق شمار کرتے ہیں اور اس پر تلخی اور عداوت کے جذبات پالنے کی بجائے رواداری اور علمی بردباری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان دونوں عظیم علما نے بھی اس امر کا بھرپور اہتمام کیا۔

سعودی عرب میں شاہی خاندان اور آل شیخ کا مرتبہ بہت بلند ہے اور ان کی مراعات بے پناہ ہیں۔ ان کے علاوہ جو مشہور خاندان ہیں ان میں سدیری' آل رشید' بن لادن' بن محفوظ' باوزیر' شربتلی' جفالی' نصیف اور ولہ تیمیلز خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شیخ کا ان میں سے کسی کے ساتھ بھی تعلق نہیں تھا مگر اپنی علمی وجاہت' تقویٰ اور اعلیٰ صلاحیتوں کی بدولت ان تمام خاندانوں کے افراد حتیٰ کہ شہزادگانؒ تک شیخ کے دروس میں نہایت عقیدت اور شوق سے شریک ہوتے دیکھے گئے۔ ذاتی معاملات میں یہ سب لوگ شیخ سے رہنمائی بھی حاصل کیا کرتے تھے۔ شیخ نے زندگی بھر دولت کی فراوانی کے باوجود پیسے کا لالچ نہیں کیا۔ انھوں

نے اپنی پوری زندگی مکمل قناعت کا نمونہ بن کر گزاری۔ اسی وجہ سے ان کو تمام حلقوں میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ایک عالم ربانی کی حیثیت سے شیخ کو جاننے والے سب لوگ یہ گواہی دیں گے کہ انھیں مادہ پرستی سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کی کسی رائے سے کسی کو اختلاف بھی ہو تو اس بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ شیخ نے دنیا کی خاطر دین بیچنے کا راستہ کبھی اختیار نہیں کیا۔

سعودی عرب کے بیشتر لوگ روایتی جفاکشی ترک کر کے نہایت کم کوش، عشرت پسند اور سہل انگار ہو گئے ہیں، مگر شیخ نے بدویانہ طرز بود و باش، سادگی اور شبانہ روز محنت کو آخر دم تک اپنا شعار بنائے رکھا۔ ان کا لباس اس قدر سادہ ہوتا تھا کہ سلف صالحین کی یادیں تازہ ہو جاتی تھیں۔ شیخ عبدالعزیز بن باز نے طویل عمر پائی اور اس عمر کا ایک ایک لمحہ بہترین انداز میں گزارا۔ ان کے پاس وقت ضائع کرنے کے لیے قطعاً کوئی گنجایش نہ تھی۔ وہ جو وقت اپنے اہل و عیال کے ساتھ گزارتے وہ بھی عملاً تعلیم و تربیت ہی پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ شیخ نے اپنے پیچھے جو اولاد چھوڑی ہے ان کے مزاج میں بھی دینی رنگ غالب ہے اور شیخ کی قناعت کا کچھ حصہ ان کو بھی ملا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ شیخ عبدالعزیز بن باز کو ان کی نیکیوں پر بہترین اجر عطا فرمائے اور امت کو اس عظیم سانحے سے سنبھلنے کے لیے ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

حدیث شریف کے مطابق دنیا سے علم کے اٹھائے جانے کا طریقہ یہی ہے کہ علمائے حق کو اٹھا لیا جائے۔ علم کے اٹھ جانے سے امت فقیر و مفلس ہو جاتی ہے۔ علمی افلاس اور قحط الرجال کے اس دور میں شیخ بن باز کا سانحہ ارتحال عظیم نقصان ہے۔ حق تعالیٰ امت پر رحم فرمائے اور مرحوم کو اعلیٰ علیین میں مقام رفیع بخشے۔

آپا زبیدہؒ بلوچ

شاخ تقویٰ پہ کھلا ہوا ایک پھول

بنت مجتبیٰ میناO

کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو دیکھنے کے بعد دوسرے نظر میں کم ہی جچتے ہیں۔ ان ہی صاحب اوصاف لوگوں میں سے ایک آپا زبیدہؒ بلوچ تھیں۔ آپ ۳۰ مئی ۱۹۹۹ کو اس دارفانی سے کوچ کر گئیں' انا للہ وانا الیہ راجعون!

سادہ سفید موٹے کپڑوں میں ملبوس' وہ ایک پاکیزہ مجسمے کی طرح بیٹھی رہتیں۔ سفید موٹے دوپٹے میں چمکتا ہوا ان کا سفید چہرہ جس میں تقویٰ کا انکسار' بڑھاپے کا وقار' درویشی کا رعب اور اللہ کی راہ میں جذبہ جہاد کا ولولہ' ان کی طرف نظر بھر کر دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ یوں تو میرا اور ان کا ساتھ ۱۹۵۵ سے ۱۹۹۰ تک رہا' خصوصیت سے یہ ساتھ ۱۹۷۷ سے بہت زیادہ رہا۔ انتخابات میں ہم ہر جگہ جاتے' ہر محلے میں چھوٹی چھوٹی کارنر میٹنگز رکھتے۔ وہاں ووٹ کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالنے کے بعد آپا زبیدہ اپنی دعا میں جماعت اسلامی کا سارا پیغام پہنچا دیتیں جو کہ دراصل قرآن کا پیغام ہوتا۔ اس کے علاوہ بھی وہ ذاتی ملاقاتوں کو بہت اہمیت دیتی تھیں۔ اتنے بڑے شہر میں شاید ہی کوئی جگہ ایسی ہو گی یا کوئی گھر اور خاندان ایسا ہو گا جہاں ہم ذاتی ملاقاتوں کے لیے نہ گئے ہوں۔

ہم تین کی ایک چھوٹی سی ٹیم تھی' آپا زبیدہ' زہرا وحید اور میں۔ جماعت اسلامی کی دعوت' اسلام کی محبت' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت' یہی تین نکات ہماری کوششوں کا محور تھے۔

آپا زبیدہ بلوچ کا کام گھاس میں پانی کی طرح اندر ہی اندر سرایت کیے ہوئے تھا۔ ان کی خاندانی وجاہت' ان کے بھائی ڈاکٹر غلام محمد بلوچ کا نام اور ان کی غیر معمولی قابلیت اور شخصیت' لاہور کے دینی'

O سابق مدیرہ ماہنامہ نور

علمی اور سیاسی گھرانوں میں جانی پہچانی تھی۔ ان کی وجہ سے بھی آپا زبیدہ بلوچ جہاں جاتیں عزت اور تکریم سے ان کو خوش آمدید کہا جاتا۔ اکثر خواتین ڈاکٹر ان کے بھائی ڈاکٹر غلام محمد بلوچ مرحوم کی شاگرد تھیں۔ اس لحاظ سے ان کا کام ڈاکٹر' پروفیسر اور سیاسی اور دینی گھرانوں کی خواتین میں خصوصیت سے تھا۔

قرآن سے ان کو غیر معمولی شغف تھا۔ قرآن پڑھنا اور قرآن پڑھانا ان کا محبوب ترین کام تھا۔ اس حدیث مبارکہ کے مصداق "تم میں بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے" وہ فجر کی نماز کے بعد سے قرآن پاک پڑھانے اور اس کا ترجمہ سکھانے کا سلسلہ شروع کرتیں اور عشاء کی نماز کے بعد تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ عشاء کی نماز کے بعد کا وقت وہ اپنے گھر والوں یعنی اپنے بھتیجی بھتیجوں کو قرآن پڑھانے اور سمجھانے میں صرف کرتیں۔ رشتے داریوں کو نبھانے اور رشتے داروں کا حق ادا کرنے کی پوری پوری کوشش کرتیں۔

اپنا کام خود کرتیں' اپنا پرس یا بیگ ہمیں اٹھانے نہیں دیتی تھیں۔ ہمیشہ ایسے موقع پر مسکرا کر کہتیں: قیامت میں ہر شخص اپنا بوجھ آپ اٹھائے گا کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔

کم خوردن و کم خفتن و کم گفتن کے مقولے پر پورا اترتے ہوئے ان سے بہتر کسی کو نہیں دیکھا۔ نرم خو' خیر خواہی اور محبت و شفقت سے بھرپور۔ روزہ دار اور شب زندہ دار' حیا کے نور سے جگمگاتی ہوئی شخصیت۔ اے کاش! ہم سب ان سے مستفید ہو سکتے ایسے جیسا مستفید ہونے کا حق تھا۔

شاید یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہو کہ وہ ایک ستھرا ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ لڑکیوں اور خواتین کو ادبی میدان میں کام کرنے کے لیے ابھارتی رہتی تھیں۔ فارسی زبان پر قدرت حاصل تھی۔ علامہ اقبال کے فارسی اشعار بہت برمحل پڑھتی تھیں۔ اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں کا گہری نظر سے مطالعہ کرتیں۔ مجھے اکثر متوجہ کرتیں کہ فلاں لکھنے والی کی تحریر بہت اچھی ہے اور فلاں کا طرز تحریر تو اتنا اچھا نہیں' لیکن خیالات بہت اچھے ہیں' ان سے رابطہ رکھو۔ مسز ممتاز شفیع صاحبہ کے خیالات اور تحریر پسند آئی تو بار بار کہہ کر ان سے رابطہ قائم کروایا۔ ان کو حریم ادب کی نشست میں تشریف لانے کو کہا۔ آخر کار وہ ہماری ایک اچھی ساتھی ثابت ہوئیں۔ حجاب امتیاز علی سے ملتیں تو ہمیں متوجہ کرتیں' اب ان کی تحریر کا رنگ بدل رہا ہے' ان سے رابطہ رکھو۔ اسلام کی محبت کی چنگاری ہر خاکستر دل میں تلاش کر لیتیں۔ ان کی کوششوں سے اکثر دلوں میں یہ چنگاری شعلہ جوالا بن کر ظاہر ہوئی۔

بچوں سے بہت محبت سے پیش آتیں۔ انھیں کوئی چھوٹا موٹا تحفہ دیتیں اور کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز ضرور دیتیں۔ بچے ان سے ڈرتے نہیں تھے۔ میں اپنی بیٹیوں اور بیٹے کو جب تک وہ بڑا نہیں ہو گیا ان کے پاس ضرور لے جاتی۔ بچوں کی بڑی تکریم کرتیں جس کا بچوں پر بہت اچھا اثر پڑتا۔ بچوں کو یہ بات یاد رہتی تھی کہ ان کے کمرے میں جائیں گے تو مٹھائی ملے گی۔ ہم سب کے بچوں کے لیے دعائیں کرتیں۔ ان کی

کامیابیوں کے لیے، ان کی دین کی سمجھ بوجھ کے لیے، ان کی مناسب جگہ شادی کے لیے، پھر ان کی اچھی نسل اٹھانے کے لیے، ان کو ماں باپ کے لیے صدقہ جاریہ بنانے کے لیے اللہ سے التجا کرتیں۔

میں نے اتنی طویل رفاقت میں ان کے منہ سے کوئی نامناسب بات نہیں سنی۔ کبھی غصے میں نہیں دیکھا۔ کسی کو برا بھلا کہتے ہوئے نہیں سنا۔ کبھی کسی کی شکایت نہیں کی۔ اپنی ذات کے بارے میں بھی زیادہ ذکر نہیں کیا۔ کسی کام پر فخر کا شائبہ تک نظر نہیں آیا۔ کبھی کچھ بتاتیں تو نہایت سادہ اور ہلکے انداز میں۔ مثلاً ان کو فون کیے بغیر کسی پروگرام کے لیے ان کے پاس پہنچ گئے کہ، چلیے اس وقت یہ پروگرام ہے تو بڑی نرمی سے معذرت کرتیں کہ آج تو یہ وقت ڈاکٹر بلقیس فاطمہ کے قرآن پڑھنے کا ہے۔ وہ ہفتہ میں دو روز سبق پڑھنے آتی ہیں۔ میں دل ہی دل میں حیران ہوتی کہ کون کون ان سے فیض یاب ہو رہا ہے! ڈاکٹر بلقیس فاطمہ نامی گرامی ڈاکٹر تھیں، جن کو دکھانے کے لیے ایک ایک ہفتہ پہلے وقت لینا پڑتا تھا۔ اسی طرح نجانے کتنی خواتین ان کی شاگرد تھیں۔

جب سے پاؤں کی ہڈی ٹوٹی تھی زیادہ چلنا پھرنا اور کہیں آنا جانا تقریباً ختم ہو گیا تھا مگر انھوں نے اپنے آپ کو معذوروں میں شامل نہیں کیا تھا۔ ان کا کام جاری تھا اور آخر وقت تک جاری رہا۔ خواتین کو قرآن سے جوڑنے کا کام، قرآن پڑھنے اور پڑھانے کا کام۔ سچ ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں داخل کرے اور ہم سب کو جنت الفردوس میں یک جا کرے۔ آمین یارب العالمین!

رسائل و مسائل

مشترکہ خاندانی نظام

سوال: میری شادی کو ۱۰ برس ہو گئے ہیں۔ میرے شوہر جماعت اسلامی کے کارکن ہیں، تحریکی لٹریچر اور رسائل کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں جب بھی اپنے شوہر سے الگ گھر کا مطالبہ کرتی ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ "موقع ملنے پر لے دوں گا۔ ابھی میرے بھائی اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوئے ہیں"۔ ۱۰ سال میں یہ موقع نہیں آ سکا۔ میرے میاں ٹیچر ہیں۔ ہمارے پانچ بچے ہیں۔ گھر کا سارا خرچ وہی اٹھاتے ہیں۔ اب جب کہ تین چھوٹے بھائی جن میں سے ایک سعودی عرب میں ملازم ہے، دوسرا محکمہ جنگلات میں اور تیسرا بھائی ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہے اور معقول آمدنی رکھتے ہیں، کیا ان حالات میں الگ گھر کے لیے میرا مطالبہ جائز نہیں، جب کہ مجھے سسرال والوں کے ساتھ رہنے میں دشواری بھی ہے؟ ان حالات میں شرعاً میرے شوہر کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب: اسلام عدل و احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی، منکرات اور ظلم و زیادتی سے روکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○ (النحل ۱۶: ۹۰) اللہ تعالیٰ عدل و احسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی، منکر اور ظلم سے روکتا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

گھروں کو عدل و احسان اور صلہ رحمی کا نمونہ بنانا اور ہر طرح کی بے حیائی اور منکرات اور ظلم و زیادتی سے پاک کرنا، اسلام کا اوّلین تقاضا ہے۔ خاندان اور معاشرے اور ریاست ہر جگہ ان تین مثبت بنیادوں کو قائم کیا جائے گا اور مذکورہ تینوں برائیوں سے روکا جائے گا۔ گھر اور خاندان کے تمام افراد کی طرح ایک شخص کی بیوی کے بھی حقوق ہیں اور ان حقوق میں سے اولین حق یہ ہے کہ اسے نان و نفقہ اور رہایش دی جائے۔ ایسی رہایش جس میں وہ آزادی کے ساتھ اپنے شوہر کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کر سکے اور اس کی پرائیویسی پوری طرح قائم ہو۔ جس میں اس کے اذن کے بغیر داخلہ نہ ہو اور اس کی چیزیں محفوظ ہوں۔

شوہر اپنی استطاعت کے مطابق اسے ایسی رہایش فراہم کرے گا۔ ایک ایسی حویلی جس میں بہت سے کمرے ہوں' ان کمروں میں ایک شخص کے ماں باپ' بہن بھائی رہایش پذیر ہوں تو اس میں ایک کمرہ ایسا بھی ہونا چاہیے جس میں اس کی بیوی رہایش پذیر ہو اور وہ آزادی کے ساتھ اس کمرے میں آجا سکتی ہو۔ دوسرے الفاظ میں وہ اس کی اور اس کی بیوی کی مختص رہایش گاہ ہو۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ مشترکہ رہایش گاہ میں عدل ہو' کسی کی حق تلفی نہ ہو' کوئی شخص کسی کی مختص رہایش گاہ میں آزادانہ آمدورفت نہ رکھے بلکہ وہ استیذان کے ضابطوں کو ملحوظ رکھے۔ لوگوں کے آرام اور خلوت کے اوقات کا خیال رکھے۔ ایک حویلی یا چار دیواری میں رہنے والے شرم و حیا' پردے اور ستر کے آداب کا خیال رکھیں۔ ایک چار دیواری میں ایک آدمی اپنے بھائیوں کے ساتھ رہتا ہو تو لازم ہے کہ بھائی ایک دوسرے کے حرم میں آنے جانے کے شرعی ضابطوں کے تابع رہیں۔

مشترکہ رہن سہن میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اخراجات کا بوجھ عدل کے ساتھ سارے لوگوں پر پڑے' کسی ایک پر بوجھ پڑے گا تو تعلقات زیادہ دیر اچھے نہیں رہیں گے۔ ایک شخص پر جہاں اس کی بیوی کے حقوق ہیں وہاں ماں باپ' بہن بھائیوں کے حقوق بھی ہیں۔ اسے سب کا خیال رکھنا ہے۔ ماں باپ' بہن بھائیوں کے حقوق کی ادائیگی کی خاطر اسے بسااوقات ان کے ساتھ رہنے کی ضرورت اور حاجت بھی ہوتی ہے۔ جب تک وہ اس قابل نہ ہو جائیں کہ الگ الگ رہ سکیں' اس وقت تک انھیں اکٹھا رہنا پڑتا ہے۔ اس لیے ایک شخص اگر اپنی بیوی کو ایسی رہایش دیتا ہے جس میں اسے مذکورہ بالا تحفظات حاصل ہوں تو اس کے بعد وہ یہ مطالبہ نہیں کر سکتی کہ اسے مشترکہ رہایش گاہ کی چار دیواری سے الگ مکان خرید کر' تعمیر کر کے یا کرائے پر لے کر دیا جائے اور اس کے لیے ایک شخص اپنے بھائیوں کے ساتھ مشترکہ بود و باش چھوڑ دے۔ بیوی کو ایسے مطالبے کا حق نہیں ہے (فقہ السنہ' ج ۲' ص ۱۸۰' امساک الزوج بمنزل الزوجیۃ)۔ البتہ اگر بھائی ایک دوسرے کی مدد کے محتاج نہ رہیں' مشترکہ رہایش میں انھیں ایسی سہولتیں حاصل نہ ہوں کہ پرائیویسی قائم رکھ سکیں اور پردے اور ستر کے آداب کی پابندی کر سکیں' جگہ تنگ ہو یا بہتر جگہ کی طرف منتقلی پیش نظر ہو تو باہمی مشورے سے متبادل انتظام کر سکتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں عموماً مشترکہ خاندانی نظام کا رواج ہے جس کے نتیجے میں لوگ سکون اور اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور ہمدردی اور غمگساری سے پیش آتے ہیں۔ جب خاندان کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ الگ الگ رہایشوں کا انتظام کر لیتے ہیں۔ حالات کے مطابق نیک نیتی کے ساتھ اکٹھی رہایش رکھنے اور الگ الگ رہایش اختیار کر لینے کی گنجایش کتاب و سنت اور ماضی کے اسلامی معاشروں کے تعامل سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ط قُلْ

اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ط وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ط وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ط وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (البقرہ ۲: ۲۲۰) آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے ایسا طریقہ اختیار کرنا جس میں ان کی بہتری ہو' اچھا ہے۔ اور اگر تم انھیں اپنے ساتھ ملا لو تو وہ تمھارے بھائی ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے مصلح کو مفسد سے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ تمھیں مشقت میں ڈال دیتا۔ اللہ غالب حکمت والا ہے---

لہٰذا جس طرح یتیم کے مال کا معاملہ ہے اسی طرح بھائیوں کا آپس میں مشترکہ رہایش اور بود و باش اختیار کرنے کا مسئلہ ہے۔ اس میں ایسا طریقہ اختیار کرنا جس میں سب کے لیے سہولت ہو' کسی کی حق تلفی نہ ہو' شرعی آداب کی خلاف ورزی نہ ہو' ضروری ہے۔

مشترکہ رہایش ہو تو اس میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اس میں کسی کے آرام و سکون اور عزت و آبرو کو خطرہ نہ ہو۔ ایک شخص کی بیوی کو مشترکہ رہایش سے کوئی جسمانی اور ذہنی تکلیف نہ پہنچتی ہو۔ سسرال کے لوگ اس کے حقوق اور آرام کا پورا خیال رکھیں اور اس کے لیے مشترکہ رہایش میں احکام شرعیہ پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

آپ نے اپنے بارے میں جو سوال کیا ہے مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں اس کا جواب یہ ہے کہ اگر آپ کو مشترکہ رہایش میں پرائیویٹ کمرہ اور الگ رہایش میسر ہے تو پھر شوہر کی اس بات کی کہ "اس کے بھائی ابھی تک اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہو سکے" رعایت کریں۔ انھیں مزید موقع دیں تا کہ وہ اپنے بھائیوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے بعد مکمل الگ رہایش اختیار کرنے کی پوزیشن میں آجائیں۔ آپ کے شوہر بھی حالات کا جائزہ لے کر یہ رائے قائم کریں کہ جو کام انھیں کچھ عرصے بعد کرنا ہے' گھریلو ماحول بہتر کرنے کی خاطر ابھی کر سکتے ہیں' تو یہ بھی مناسب ہو گا۔

الگ رہایش میں جہاں مشترکہ رہایش کے مسائل سے آدمی محفوظ ہو جاتا ہے وہاں تنہائی کا احساس بھی ہوتا ہے اور باہمی تعاون کے سلسلے میں رشتے داروں اور بہن بھائیوں کا اس طرح تعاون حاصل کرنے سے محروم ہو جاتا ہے جس طرح مشترکہ رہایش گاہ میں مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ واللّٰہ اعلم! (مولانا عبدالمالک)

مشترک خاندان اور مشکوک آمدنی

س: برعظیم میں عام طور پر مشترکہ خاندانی نظام رائج ہے جس میں تمام ذرائع آمدن کو اکٹھا کر دیا جاتا ہے اور اس مشترکہ آمدنی سے خاندان کے تمام اخراجات پورے کیے جاتے ہیں۔ سوال یہ

ہے کہ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ مذکورہ نظام کے تحت چلنے والے کسی خاندان میں شامل کمانے والے افراد میں سے کسی ایک یا چند افراد کے ذرائع آمدن مشکوک یا خلاف شرع ہیں تو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک تحریکی فرد کو کیالائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے اور مشترکہ آمدنی میں مشکوک ذرائع آمدن سے حاصل شدہ مال سے خود کو اور اپنی اولاد کو کس طرح محفوظ رکھا جائے؟

ج : مشترک آمدن سے اگر گھر کے اخراجات پورے کیے جاتے ہوں اور خاندان کے بعض افراد کی آمدنی حرام ہو اور افراد خانہ کو علم ہو' صرف شک اور وہم نہ ہو' تو اس صورت میں حرام ذرائع سے کمانے والوں کو شراکت سے الگ کر دیا جائے اور دوسرے افراد خانہ اپنا کھانا پینا ان سے جدا کر دیں۔ اس کے ساتھ وعظ و نصیحت کے ذریعے حرام کمائی کے مرتکب افراد کی اصلاح کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ حرام کمانے اور حرام کھانے سے ہر مسلمان کو بچائے۔ آمین (مولانا گوھر رحمن)

کمیٹی ڈالنے کی شرعی حیثیت

س : ہمارے ہاں اکثر چند افراد مل کر کمیٹی ڈالتے ہیں جس میں ہر رکن ہر ماہ ایک مقرر رقم ادا کرتا ہے (تمام افراد کا حصہ برابر ہوتا ہے)۔ ہر ماہ تمام افراد کی ادا شدہ رقم ایک فرد کو ادا کر دی جاتی ہے۔ کس ماہ کمیٹی کے کس رکن کو ادائگی کی جائے' اس کا فیصلہ عام طور پر قرعہ اندازی کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ عمل عام بچت کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ اس میں کسی کا بھی نقصان نہیں ہوتا اور کسی کو بھی اس کی ادا کردہ رقم سے زیادہ حصہ نہیں ملتا لیکن کچھ ساتھی اس سارے عمل کو قرعہ اندازی کی وجہ سے جوے کی ایک قسم قرار دیتے ہیں۔ براہ کرم قرآن و سنت اور اسلامی قوانین کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں تاکہ ذہن سے شکوک رفع ہو سکیں؟

ج : کمیٹی ڈالنے کا جو طریقہ آپ نے بیان کیا ہے اس پر شرعاً کوئی اعتراض نہیں۔ یہ تو باہمی تعاون کا ایک اجتماعی طریقہ ہے۔ باقی رہی قرعہ اندازی تو اس کی ہر صورت ممنوع نہیں ہے بلکہ وہ صورت ممنوع ہے جو جوئے میں ہارنے جیتنے کے لیے ہو۔ یہ صورت جوئے کی نہیں ہے بلکہ مشترک فنڈ کو تمام شرکا باری باری استعمال کرتے ہیں۔ لیکن پہلے کون استعمال کرے اور دوسرے تیسرے نمبر پر کون استعمال کرے؟ اس کے لیے قرعہ اندازی کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جو قابل اعتراض نہیں ہے۔ (گ - ر)

انعامی اسکیمیں

س : بڑی بڑی مارکیٹیں اور کمپنیاں گاہکوں کو زیادہ سے زیادہ راغب کرنے کے لیے انعامی اسکیمیں پیش کرتی ہیں جن میں شرکت کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ آپ متعلقہ کمپنی کی کوئی چیز خریدیں تو وہ آپ کو مفت کوپن دیتے ہیں جسے پر کر کے آپ متعلقہ فرد کے حوالے کر دیتے ہیں۔ مقررہ مدت کے بعد مذکورہ کمپنیاں جمع شدہ تمام کوپن اکٹھے کر کے قرعہ اندازی کے ذریعے چند افراد کو بھاری انعامات دیتی ہیں اور ان کی خوب تشہیر بھی کرتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح کی انعامی اسکیموں میں حصہ لینا درست ہے اور ان سے حاصل شدہ انعامات ذاتی استعمال میں لائے جا سکتے ہیں؟

ج : انعامی بانڈز کی جو اسکیمیں مختلف ناموں سے بنکوں یا حکومتی اداروں کی طرف سے ملک میں چل رہی ہیں' مثلاً "کروڑ پتی سکیم" اور "مالا مال سکیم" یہ تو ناجائز ہیں اور سود اور جوئے' دونوں پر مشتمل ہیں۔ البتہ تاجروں کی جن انعامی اسکیموں کا آپ نے ذکر کیا ہے یہ جائز ہیں بشرطیکہ چیزیں مارکیٹ کے نرخ سے زیادہ قیمت پر فروخت نہ کی جائیں بلکہ اصل قیمت پر فروخت کی جائیں اور کوپنوں پر قرعہ اندازی کے ذریعے انعام دیا جائے۔ اس پر کوئی اعتراض نہیں آتا' اس لیے کہ خریدار نے جو رقم تاجر کو دی ہے اس کے بدلے میں اسے چیز مل گئی ہے اور انعام دکاندار نے اپنے مال کی مشہوری کے لیے اور لوگوں کو راغب کرنے کے لیے دیا ہے۔ لیکن اگر ۱۰۰ روپے کی چیز ۱۵۰ روپے میں خریدی گئی تھی اور ۵۰ روپے زائد انعام ملنے کی امید پر دیے گئے ہیں تو یہ جوئے کی شکل بن جاتی ہے اور یہ ناجائز ہے۔ (گ - م)

لڑکی کی رضامندی : ایک وضاحت

س : ترجمان القرآن (جون ۱۹۹۹) میں آپ کا جواب بہ سلسلہ "لڑکی کی رضامندی" شائع ہوا جو فی نفسہٖ درست موقف پر مبنی ہے۔ لیکن اس میں غصے یا ردعمل کی ایک بڑی بنیاد خط و کتابت وغیرہ کا سلسلہ ہے۔ ماضی کے معاشروں کی نسبت عصر حاضر کے مسائل و معاملات میں بہرحال تغیر واقع ہوا ہے۔ جس میں خط و کتابت' فون' ای میل' کلاس نوٹس اور تہنیت کارڈ وغیرہ سب کے موثر ہونے کا امکان موجود ہے۔ آپ نے اپنے جواب میں اس براہ راست سلسلہ جنبانی پر جو کلام نہیں کیا' وہ میری ناقص عقل کے مطابق فتنے کا باعث بن سکتا ہے۔ براہ کرم وضاحت فرمایئے' تاکہ سماجی سطح پر فتنے سے بچا جا سکے۔

ج : آپ نے جس فروگزاشت کی طرف توجہ دلائی ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ حیا اسلامی تہذیب کا نمایاں امتیاز ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہر دین کا ایک اخلاق ہوتا ہے اور اسلام کا اخلاق حیا ہے"۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی شان یہ تھی کہ "آپ باکرہ پردہ نشین سے بھی زیادہ حیا دار تھے"۔ اسلام میں اس بات کی کوئی گنجایش نہیں ہے کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں آپس میں کسی بھی سطح پر رابطے رکھیں اور نامہ و پیام اور خط و کتابت اور میل ملاپ سے کام لیں۔ ہمارے معاشرے میں تو جس لڑکی کی نسبت ٹھہر جاتی ہے تو وہ شادی سے پہلے منگیتر کے سامنے کسی بھی مجلس میں نہیں آتی۔ کسی دینی یا دنیوی ضرورت کے بغیر لڑکے اور لڑکی کے آپس میں سلام و کلام اور آمنے سامنے ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ اسلامی سوسائٹی مخلوط مجالس اور خفیہ دوستیوں اور راز و نیاز کے سلسلوں سے پاک سوسائٹی ہوتی ہے۔ اس لیے جس جوڑے نے آپس میں خط و کتابت اور راز و نیاز کے ذریعے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کا فیصلہ کیا اس نے اسلامی تہذیب کی خلاف ورزی کی اور شرم و حیا کی چادر کو تار تار کیا۔

میں نے اپنے جواب میں اس پر اس لیے کلام نہیں کیا تھا کہ سوال میں غلطی کے مرتکب جوڑے نے اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ انھوں نے ایسا کر کے شدید غلطی کی ہے۔ سوال ان کے اس طرز عمل کے بارے میں نہیں تھا بلکہ اس غلطی کے وقوع پذیر ہونے کے بعد مستقبل میں لڑکی کی مرضی کے علی الرغم شادی کر دینے کا تھا۔ اس لیے میں نے اصل سوال پر کلام کرنے پر زیادہ توجہ دی اور غلطی کے ارتکاب پر بحث کرنے کے بجائے اسے محض غلطی کہنے پر اکتفا کیا لیکن اس سکوت اور اجمال کا نقصان بھی ہو سکتا ہے اور لوگ اس سے غلط نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں جیسے کہ آپ نے توجہ دلائی۔ اس لیے اس کا نوٹس لینا ضروری تھا۔ (ع - م)

کتاب نما

کہوٹہ سے چاغی تک' فیضان اللہ خان۔ ناشر: دور نو پبلی کیشنز' ۴۵ حبیب پارک' لاہور ۵۴۷۸۰۔ صفحات: ۱۹۱۔ قیمت: ۷۵ روپے۔

اس برس ۲۸ مئی ۱۹۹۸ کو "یوم تکبیر" کے طور پر منایا گیا۔ بلاشبہ یہ دن' تاریخ پاکستان میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایٹمی دھماکے نے اہل وطن میں ایک نیا عزم اور ولولہ پیدا کیا اور وہ خود اعتمادی کے جذبے سے سرشار ہوئے۔ اب اگر انھیں اقبال کے الفاظ میں کوئی "میر کارواں" مل جائے تو وہ قوم کے ولولوں اور عزائم کے بل بوتے پر' اس کی تقدیر پلٹ سکتا ہے۔ پاکستان کو ۲۸ مئی ۱۹۹۸ کے مرحلے تک پہنچنے کے لیے کن دشواریوں سے گزرنا پڑا؟ کیا رکاوٹیں درپیش آئیں؟ اور مختلف افراد اور اداروں نے اس ضمن میں کیا کردار ادا کیا؟--- زیرنظر کتاب میں' نہایت سلیقے اور عمدگی کے ساتھ اس سلسلے کی مرحلہ وار کہانی بیان کی گئی ہے۔ مزید برآں "پاکستان کے ایٹمی دھماکوں سے متعلق تمام سیاسی' تاریخی' جغرافیائی' تکنیکی اور سائنسی پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے"۔ بہ قول مصنف: "کتاب کا بنیادی مقصد' ایک عام آدمی کے تجسس کی پیاس بجھانا اور اسے چاغی میں سر کیے جانے والے معرکے سے متعلق ہر قسم کی معلومات بہم پہنچانا ہے" (ص ۱۴)۔

بین الاقوامی تناظر میں' نیز عالم اسلام کے حوالے سے پاکستان کے ایٹمی دھماکے کی اہمیت اور اس کے دور رس اثرات' کتاب کے پہلے باب کا موضوع ہیں۔ دوسرے باب میں چاغی کے محل وقوع اور جغرافیے کا بیان ہے۔ مضبوط ساخت کے راس کوہ کی سنگلاخ چٹان کے اندر چار سال کی محنت شاقہ کے بعد ۱۹۸۴ میں ایک کلومیٹر لمبی آڑی ترچھی سرنگ تیار ہوئی۔ پھر ۱۲ مئی کے بعد سرنگ کے اندر اور باہر ضروری آلات اور کیمروں کی تنصیب ہوئی' بڑی طاقتوں کا شدید دباؤ تھا مگر پاکستان کی رائے عامہ کا دباؤ غالب آیا۔ گرین سگنل ملا اور ۲۸ مئی کو ۳ بج کر ۱۶ منٹ پر راس کوہ میں ایک خوفناک زلزلہ آیا۔ پاکستان ایٹمی ممالک کی صف میں شامل ہو گیا--- یہ سب تفصیل ایک دلچسپ ڈرامائی صورت میں بیان کی گئی ہے۔

فیضان اللہ خان' طبیعیات میں ایم ایس سی ہیں۔ انھوں نے صرف خارجی مراحل کے بیان پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایٹم کی نوعیت' ایٹم بم کی تیاری' ایٹمی دھماکوں کی اقسام' ان کی تاریخ اور ان کے اثرات وغیرہ کے

بارے میں بھی فنی اور تکنیکی معلومات مہیا کی ہیں۔ مصنف نے اس ضمن میں بہت سے متعلقہ موضوعات پر بھی عام فہم انداز میں معلومات بہم پہنچائی ہیں جیسے: نیوکلیائی طبیعیات کے اصول' یورینیم کی افزودگی' ایٹمی دور کا آغاز' تابکاری کی دریافت' ایٹم کی ساخت' پہلا ایٹمی تجربہ' دوسری جنگ عظیم' ہیروشیما اور ناگاساکی کا المیہ' امریکی تہذیب کا اصل چہرہ وغیرہ...... اس طرح مصنف نے تاریخ' سائنس اور عالمی سیاست کے حوالے سے مباحث میں تنوع پیدا کر کے کتاب کو دلچسپ اور معلومات افزا بنا دیا ہے۔

پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا آغاز' پیش رفت اور تکمیل کے ضمن میں مصنف کے مطابق سب سے نمایاں نام ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں سقوط مشرقی پاکستان ہوا تو وہ ہالینڈ میں زیر تعلیم تھے۔ انھوں نے اس سانحے سے گہرا اثر قبول کیا۔ ۱۹۷۴ء میں بھارت کے ایٹمی دھماکے کے بعد انھوں نے عملاً کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے عبدالقدیر خان کے منصوبے سے اتفاق کیا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ۳۰ ہزار روپے کی ملازمت چھوڑ کر وہ ہالینڈ سے وطن آگئے اور پاکستان اٹامک انرجی کمیشن میں ۳ ہزار روپے کی ملازمت اختیار کر لی' مگر انھیں کمیشن والوں کا تعاون حاصل نہ ہو سکا تو انھوں نے ۱۹۷۶ء میں کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز قائم کر کے یورینیم کی افزودگی کا کام شروع کر دیا۔ مصنف نے بتایا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے جس "جانفشانی' لگن اور جذبے سے اس پر عمل درآمد شروع کیا وہ ہماری تاریخ کا ایک درخشندہ باب ہے"۔ انھوں نے دن رات ایک کر دیا' وہ اتنے پرجوش تھے کہ اصل پلانٹ کی تعمیر و تکمیل سے پہلے ہی ایک چھوٹی سی لیبارٹری میں یورینیم کی افزودگی پر کام شروع کر دیا اور ابھی اصل پلانٹ زیر تعمیر تھا کہ ۴ / اپریل ۱۹۷۸ء کو اس عارضی لیبارٹری میں یورینیم کی افزودگی کا کامیاب تجربہ مکمل کر لیا۔ عبدالقدیر خان کی کاوشوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک و ملت سے محبت اور اس کے لیے دردمندی کے جذبات سے سرشار ایک شخص تمام تر مشکلات اور حوصلہ شکنیوں کے باوجود بھی کامیابی سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ انسان کے عزم صمیم کے سامنے کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

آخری باب کا عنوان ہے: "پاکستان' اسلام کا قلعہ"۔ اس باب میں سی ٹی بی ٹی' پاکستان میں سائنس اور ٹکنالوجی کی پسماندگی' معیار تعلیم کی پستی' تعلیمی نظام کی ابتری اور نظام معیشت کی زبوں حالی وغیرہ کا ذکر ہے۔ اختتام ان سطور پر ہوتا ہے: "پاکستان کی تخلیق کا اصل مقصد اسلامی نظام کی برکتوں سے مستفید ہونا اور اسے امت مسلمہ کی رہنمائی کے منصب پر فائز کرنا تھا۔ ایٹمی قوت بن کر ہم نے منزل مقصود کی جانب صرف ایک قدم بڑھایا ہے۔ اس راہ میں ابھی بہت سا سفر کرنا باقی ہے۔ پاکستانی قوم کو اگر مخلص اور مناسب رہنمائی مل جائے تو وہ یہ کٹھن سفر طے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ نظام کی تبدیلی وقت کی اہم ترین ضرورت بن چکی ہے۔ حکومتی ڈھانچے پر حاوی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے لوگ بیزار ہو چکے ہیں"۔

کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی نوجوان مصنف اپنی پہلی ہی کتاب میں ایسی تالیفی مہارت دکھائے' زبان و بیان بھی عمدہ ہو' موضوع بھی اس کی گرفت میں ہو اور کتاب سے ایک قومی اور ملی نقطۂ نظر بھی ظاہر ہوتا ہو۔ یہ مصنف کی ذہانت ہے اور غالباً ان کے فاضل گرامی والد (پروفیسر آسی ضیائی) کا فیضان بھی' جن کے نام' انھوں نے یہ کتاب انتساب کی ہے۔

ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ کتاب کی تالیف و تدوین کے ساتھ' کمپوزنگ' پروف خوانی اور انتخاب تصاویر کے کام بھی فیضان صاحب نے خود ہی انجام دیے ہیں اور جو تصاویر نہ مل سکیں وہ انھوں نے اپنے ہاتھ سے تیار کی ہیں--- بلاشبہ زیر نظر کتاب "پاکستان کے ایٹمی قوت بننے کی دل افروز داستان" (سرورق) ہے۔ بالخصوص نوجوان طلبہ کو اس کا مطالعہ ضرور ہی کرنا چاہیے (رفیع الدین ہاشمی)۔

خود نوشت افکار سرسید' سرسید احمد خاں' مرتبہ: ضیاء الدین لاہوری۔ ناشر: فضلی سنز لمیٹڈ' پارسی بلڈنگ' اردو بازار' کراچی۔ صفحات: ۲۷۲۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

"سرسید احمد خاں (۱۸۱۷-۱۸۹۸)' علامہ اقبال (۱۸۷۷--۱۹۳۸) اور قائداعظم (۱۸۷۶-۱۹۴۸) کے لبرل اسلام کے علم بردار تھے۔ یہ اور قائداعظم بانیان پاکستان تھے' اس لیے پاکستان میں انھی کی تعبیر اسلام پر عمل پیرا ہونا چاہیے"------ اس طرح کی بات بڑے تسلسل کے ساتھ دہرائی جاتی ہے اور پسماندگان اقبال نے بھی اسی بات کو اپنی فکر کا سرعنوان بنا رکھا ہے۔ معلوم نہیں کہ وہ اس حوالے سے اقبال دوستی کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں یا انہدام اقبال کی راہ ہموار کرنا چاہتے ہیں... بہرحال زیر تبصرہ کتاب اس خدشے کی تائید کرتی ہے۔ اس کتاب مین جو افکار' بطور خود نوشت سرسید مرحوم' پیش کیے گئے ہیں' ان میں سے ۹۵ فی صد کی تو' اقبال مرحوم ہرگز تائید کرتے دکھائی نہیں دیتے۔

مسلمانان جنوب مشرقی ایشیا کی فکری' سیاسی اور سماجی زندگی پر سرسید مرحوم نے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر سلفی العقیدہ تھے' مگر اپنے کئی ہم مکتب دانش ور رجال کی طرح دینی معاملات میں آزاد روی کا شکار ہو گئے۔ مغرب سے مرعوبیت اور عبرت ناک ٹھوکروں کے باوجود بلاشبہ ان کا دل رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں یوں تڑپتا تھا کہ بہت سے مذہبی قائدین بھی اس پر رشک کر کے رہ جائیں۔ افسوس کہ ان کا یہ پہلو نظرانداز ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے خطہ ہند پر فرنگی برہمن اتحاد سے پیدا ہونے والے عبرت ناک مستقبل کی پیش بینی کرتے ہوئے' اس درد کی دوا انگریزی تعلیم میں تلاش کی۔ اس ذیل میں ان کے نتیجہ فکر کے غلط یا صحیح ہونے کی بحث کو چھوڑ دیا جائے' تو واقعہ یہ ہے کہ اپنی دانش کی حد تک انھوں نے اخلاص ہی سے یہ راستہ تجویز کیا۔ اس لیے ایک قوم پرست

مسلمان رہنما کی حیثیت سے ان کا مقام نمایاں ہے۔

جناب ضیاء الدین لاہوری "سرسید سٹڈیز" میں اختصاص رکھتے ہیں، وہ اس موضوع پر کئی تصانیف پیش کر چکے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی جانب سے، یا سرسید کے مخالف و موافق عناصر کی آرا کو پیش کرنے کے بجائے ان کی اپنی تحریروں سے، ان کی "خود نوشت" مرتب کی ہے۔

سرسید مرحوم کی ان (خود نوشت) تحریروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ فطرت پرستی اور خرد افروزی کے اس درجہ قائل تھے کہ انھوں نے معجزات انبیا اور احادیث رسولؐ میں بیان کردہ بہت سی باتیں عقل عام کی بنیاد پر مسترد کر دیں۔ ایسا فیصلہ دیتے وقت کہیں تو ان کا لہجہ سخت تکلیف دہ ہوتا ہے مثلاً پیدایش عیسیٰ علیہ السلام، آتش نمرود، قربانی، زم زم، معراج، جنت دوزخ وغیرہ۔ بلاشبہ انھوں نے بہت سے امور میں اسرائیلیات اور وضعی احادیث کو ماننے سے انکار کیا ہے، مگر "نیچریت" کے جوش میں وہ توازن برقرار رکھنے میں ناکام رہے۔ اس طرح ان کی تحریروں کی زد مسلمات اور متفق علیہ امور پر بھی پڑی۔

بیسویں صدی کے چند مفسرین نے زانی کے لیے "سزائے رجم" کی تردید کرنے میں، بظاہر پہل کی ہے۔ شاید انھیں معلوم نہیں کہ سرسید مرحوم یہ "کارنامہ" ان سے پہلے انجام دے چکے تھے (ص ۲۳۲)۔ ایک عجیب بات ہے کہ خاص طور پر سیکولر لابی اپنے لیے سرسید، اقبال اور نیاز فتح پوری وغیرہ کو خردمندی کا لائٹ ہاؤس تسلیم کرتی ہے۔ مگر یہ تینوں حضرات عورت کے چہرے کے پردے کے نہ صرف قائل تھے بلکہ داعی اور اپنے گھروں میں اس پر عامل بھی تھے۔ سرسید لکھتے ہیں: "ہم عورتوں کا پردہ، جو مسلمانوں میں رائج ہے، اس کو نہایت عمدہ سمجھتے ہیں" (ص ۱۶۶)۔

سرسید مرحوم نے الہیات اور دینیات پر قلم اٹھانے کے لیے واقعی بڑی محنت کی، مگر افسوس کہ ان کا زاویۂ نظر درست نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامیان ہند کے اجتماعی ضمیر نے ان کی قومی خدمات کا تو کھل کر اعتراف کیا، مگر مرحوم کے مذہبی افکار کو قبول نہیں کیا۔ اب ان کے مذہبی افکار کا بار بار سامنے لانا اور انھیں مذہبی ریفارمر کے طور پر مثال و سند بنانا کار عبث ہے۔ مناسب یہی ہے کہ ان کا تذکرہ ان کے قومی کارناموں تک محدود رکھا جائے۔

جناب ضیا الدین نے بڑی دیدہ ریزی، اور کمال محنت و مشقت سے ہزاروں صفحوں پر پھیلی ہوئی تحریرات سرسید کو پڑھ کر ان سے یہ لوازمہ نکالا، اور حسن ترتیب سے پیش کیا ہے۔ اگرچہ کئی موضوعات پھر بھی رہ گئے ہیں، خاص طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور ان کے دفاع کے لیے سرسید کے تڑپتے جملوں سے یہ کتاب خالی ہے۔ اسی طرح سرسید نے امت میں مختلف متفق علیہ پہلوؤں کی تردید کے لیے جو استدلال کھڑا کیا، اور جن دلائل کا سہارا لیا، کتاب ان سے بھی خالی ہے، البتہ صرف نتیجہ سامنے

آ جاتا ہے۔ بہرحال یہ کتاب کسی صاحب ذوق فرد کو راستہ ضرور دکھا دیتی ہے کہ اگر وہ خاور شناس ہے تو اصل ماخذ تک پہنچ کر مراد پائے (سلیم منصور خالد)۔

تابخاک حرم، ڈاکٹر محمود الحسن عارف۔ ناشر: الفیصل، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۱۸۰۔ قیمت۔ ۱۲۵ روپے۔

اردو میں حج کے سفرناموں کی روایت بہت قدیم ہے۔ جو صاحب ایمان حج بیت اللہ سے مشرف ہوتا ہے، قدرتی طور پر وہ چاہتا ہے کہ اپنے پاکیزہ اور والہانہ جذبات و احساسات میں دوسروں کو بھی شریک کرے۔ حرمین شریفین کی زیارت اور عمرہ و حج کے مختلف مراحل میں ایک مسلمان روحانی طور پر جس سرخوشی و سرشاری سے دوچار ہوتا ہے، اس کا اظہار بجائے خود ایک طمانیت و تسکین کا باعث بنتا ہے۔ ڈاکٹر محمود الحسن عارف صاحب نے ۱۹۹۴ میں حج بیت اللہ اور روضہ رسولؐ کی زیارت کی اور سفرنامہ قلم بند کیا، مگر انھیں سفرنامے کی طباعت میں تردد رہا۔ بار بار یہ خیال آتا کہ یہ تو سراسر خود نمائی ہے لیکن پھر سوچ کر کہ "اگر حرمین کے سفرنامے لکھنا خود نمائی ہوتا تو اس عنوان پر بہت سے قدیم و جدید بزرگوں کے سفرنامے اتنی تعداد میں محفوظ اور مدون صورت میں نہ ملتے" انھوں نے احوال سفر کو تابخاک حرم کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ حج کے سفرنامے مختلف اسالیب میں لکھے گئے ہیں۔ عارف صاحب نے بہ ظاہر روداد سفر بیان کی ہے مگر اس میں جذبات و احساسات اور تاثرات کا اظہار بھی ہے۔ کراچی سے روانگی کی "یہ رات کیف و مسرت اور فرحت و انبساط کی رات تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تمام کائنات وجد میں ہے اور تمام فضا روشنی و کیف سے معمور ہے" (ص ۲۲)۔ "بیت اللہ اپنے تمام تر جاہ و جلال کے ساتھ عظمت و بزرگی کی چادر اوڑھے ہوئے ہمارے سامنے تھا۔ نظر پڑتے ہی بے اختیار ہاتھ آسمان کی طرف اٹھ جاتے ہیں اور زبان پر دعا و ذکر کے زمزمے جاری ہو جاتے ہیں" (ص ۴۱)۔

جہاں کہیں نثر، جذبات کے تموج کا ساتھ نہیں دیتی، وہ شعر کا سہارا لیتے ہیں۔ انھوں نے اردو، فارسی اور عربی کے بہ کثرت اشعار کو اظہار جذبات کا ذریعہ بنایا ہے۔ کہیں کہیں تو ابو الکلامی انداز بہت نمایاں ہے، بلکہ اشعار کی خاصی تعداد غبار خاطر میں مذکور اشعار ہی کی ہے۔ مصنف ایک عالم دین بھی ہیں، اس لیے انھوں نے حسب موقع حج بیت اللہ کے مختلف پہلوؤں اور مراحل کے بارے میں قرآن و حدیث کے احکام بیان کر دیے ہیں اور مسنون دعائیں بھی نقل کر دی ہیں۔ اس طرح زیر نظر سفرنامہ ایک بابرکت سفر کی روداد بھی ہے اور حجاج کے لیے ایک اچھی رہنما کتاب بھی۔ جو لوگ عمرہ و حج کے تجربے سے گزر چکے ہوں ان کے لیے بھی یہ ایک لائق مطالعہ کتاب ہے (ر-ہ)۔

اسلام اور سودی نظام' محمد آصف احسان۔ ناشر فاران پبلی کیشنز' پوسٹ بکس ۱۰۷۱' فیصل آباد۔ صفحات ۱۷۴۔ قیمت ۳۵ روپے۔

عہد حاضر کے معاشی مفاسد کی ایک بڑی وجہ معیشت کے رگ و پے میں سود کے زہر کی موجودگی ہے۔ اس نے نہ صرف تقسیم دولت کے منصفانہ نظام کے قیام کو ناممکن بنا دیا ہے بلکہ اشیا و خدمات کی پیدائش کے بارے میں آجروں کے فیصلوں کا رخ بھی عامۃ الناس کی فلاح و بہبود کے بجائے مترفین کی مسرفانہ عیاشیوں کی طرف موڑ دیا ہے۔ مشرق و مغرب میں سودی نظام کی تلخیوں کا احساس اور اعتراف تو بڑھ رہا ہے لیکن اس کی جگہ غیر سودی نظام کے قیام کی خواہش یا پھر اس کے لیے کوشش ہنوز ناپید ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مغرب کو اپنے معاشی ارتقا کے لیے فراہمی سرمایہ کا سود کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نظر نہیں آتا۔ غیر سودی بنیادوں پر تشکیل پانے والا معاشی نظام صرف اور صرف اسلام کے پاس ہے۔ کم و بیش ایک ہزار سال تک دنیاے معلوم کے بہت بڑے حصے میں اس کے تحت کاروبار معیشت حسن و خوبی کے ساتھ انجام بھی پاتا رہا۔ مغرب تو اپنے روایتی تعصب کی بنا پر اسلام کے اس نظام کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا لیکن مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بھی اس کے قابل عمل ہونے کے بارے میں تشکیک کا شکار ہے۔

زیر نظر کتاب میں بڑی بالغ نظری کی ساتھ اس تشکیک کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سودی نظام کے مفاسد کا محاکمہ اور اس کے جواز کے نظریات کا ابطال کیا گیا ہے اور قرآن و سنت کے شواہد اور مفکرین اسلام کی آرا کی روشنی میں سود کی برائی کو واضح کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ روز مرہ زندگی سے تعلق رکھنے والے بہت سے مسائل مثلاً بنک کے سود' انعامی بانڈز' پراویڈنٹ فنڈ' سیونگ سرٹیفیکیٹ اور مارک اپ وغیرہ کے متعلق اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔

کتاب کی افادیت بہت بڑھ جاتی اگر اس میں بلاسود بنک کاری کا کوئی ماڈل پیش کر دیا جاتا۔ بحیثیت مجموعی غیر سودی نظام پر منتشر مواد کو یک جا کرنے اور اس سلسلے میں اسلامی نقطہ نظر کو اعتماد کے ساتھ پیش کرنے کی یہ ایک کامیاب کوشش ہے (عبدالحمید ڈار)۔

Historical Sikh Shrines in Pakistan' (پاکستان وچ سکھاں دیاں تاریخی یادگاراں) اقبال قیصر۔ ناشر پنجابی تواریخ بورڈ' ۱۳۰ ای' بی ون' ٹاؤن شپ' لاہور۔ مجلاتی سائز' صفحات ۴۴۲۔ قیمت ۲۰۰۰ روپے یا ۴۵ ڈالر۔

اسلام اپنے ماننے والوں کو دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں اور معابد کے احترام کا درس دیتا ہے البتہ اگر انہیں دھوکا دینے کے لیے مسجد ضرار بنائی جائے تو اس کے بارے میں بھی واضح حکم موجود ہے۔ جہاں نہیں

اِکا دکا واقعات اس روایت کے خلاف رونما ہوئے' وہاں ریاست نے اس کی تائید نہیں کی' اور مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر نے بھی انھیں شدید ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ بوسنیا اور کوسووا میں عیسائی سربوں کے ہاتھوں مسجدوں کی پامالی کے باوجود پوری مسلم دنیا میں کہیں بھی کسی گرجا گھر کو کوئی گزند نہیں پہنچی۔

اگست ۱۹۴۷ء سے قبل خاص طور پر' پاکستانی پنجاب میں سکھوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ بھارتی پنجاب میں بھی مسلمانوں کی بڑی آبادیاں موجود و قائم تھیں' ضلع فیروز پور تو تھا ہی مسلم اکثریتی ضلع۔ پاکستانی پنجاب میں سکھوں کی بہت سی تاریخی اور مذہبی اعتبار سے اہم عمارات اب بھی موجود ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں صرف مذہبی اعتبار سے اہم عمارتوں کی ۱۸۰ رنگین تصاویر شائع کی گئی ہیں اور ان کا تعارف اور پس منظر' انگریزی' پنجابی (گورمکھی اور فارسی رسم الخط) میں دیا گیا ہے۔ ان عمارتوں میں پانچ مسلمان صوفیا (بابا فرید' میاں میر' رائے بلار' شاہ دولہ اور حمزہ غوث) کے مقابر اور مرقد بھی شامل ہیں' جنھیں سکھ مت میں بہت احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

ہر مذہب کے پیروکار اپنے معبدوں کے لیے بڑے نازک جذبات رکھتے ہیں۔ اگرچہ ۱۹۴۷ء میں مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کے نتیجے میں سکھوں نے اپنے تئیں اپنے حصہ زمین سے مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیا تھا' تاہم بھارت میں اب بھی مسلمانوں کے جذب و شوق کی علامتیں اور سجدوں کی رازداں بہت سی مسجدیں موجود ہیں' مگر ان کی حالت افسوس ناک ہے۔ وہاں جانور بندھے ہوئے ہیں یا پھر یہ مساجد رہایشی عشرت کدوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ ظاہر ہے یہ منظر دیکھ کر ہر مسلمان کا دل تڑپے گا۔ تصویر کا دوسرا رخ زیر تبصرہ کتاب دکھا رہی ہے۔ یہاں چند مرکزی عمارتوں کو چھوڑ کر سکھوں کی مذہبی عمارتوں میں سے اکثر کی حالت اطمینان بخش نہیں ہے۔

کتاب میں دی گئی تصویروں کو دیکھا جائے تو بہت سی عمارتیں واقعی مسلمانوں کے تہذیبی مزاج' دینی ذوق' مذہبی رواداری اور علمی مذاق سے مغایرت پر ماتم کناں دکھائی دیتی ہیں۔ اسلام ہمیں ایسے رویے سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ کاش اسے دیکھ کر ہمیں بھولا ہوا سبق یاد آ جائے اور کاش' کوئی سکھ آگے بڑھ کر مشرقی پنجاب اور ہریانہ میں اصطبل کا منظر پیش کرتی ہوئی مسجدوں اور اہم مقامات کی عکس بندی کر کے اسی اہتمام سے شائع کرے' جس طرح لاہور سے ایک پرائمری اسکول کے مسلمان استاد اقبال قیصر نے سکھوں کی متبرک عمارتوں کا کھوج لگانے کے لیے اسکردو سے کراچی اور کوئٹہ تک اور جیکب آباد سے لاہور اور پشاور تک خاک چھانی۔ یہ وضع داری دین اسلام کا ثمر ہے بلکہ ایسا تال میل برہمنی استبداد کی چیرہ دستیوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے کسی صف بندی میں معاون بھی بن سکتا ہے۔ اس سے بھی اہم تر حقیقت یہ ہے کہ اسلام اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک دعوتی دین ہے' اور ایک داعی صرف اسی وقت اپنی بات سمجھا سکتا ہے جب وہ حکمت اور احترام آدمیت کے مغز کو پا لے۔ احترام معابد بھی حکمت کی ایک بڑی

بنیادی علامت ہے (س - م - خ) -

سعید پارے، مرتبہ: مسعود احمد برکاتی۔ ناشر: نونہال ادب، ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ہمدرد سنٹر، ناظم آباد، کراچی۔ صفحات: ۱۹۰۔ قیمت: ۷۰ روپے۔

حکیم محمد سعید شہید کے دست راست جناب مسعود احمد برکاتی نے حکیم صاحب کے مقبول کالم "جاگو جاگو" کا ایک انتخاب مختلف عنوانات کے تحت پیش کیا ہے۔ اس میں جنوری ۱۹۸۵ سے نومبر ۱۹۹۸ تک کے کالم شامل ہیں۔ یہ زندگی کے مختلف پہلوؤں اور متنوع گوشوں پر تقریباً ایک ایک صفحے کے سادہ و مختصر مگر موثر مضامین کا مجموعہ ہے۔ عبادات، تہوار، اخلاق، اعمال، وطن، قائداعظم اور ووٹ کے متعلق مثالوں، تمثیلوں، آیات قرآنی، اسوۂ حسنہ اور عمومی واقعات کی مدد سے اچھی اچھی باتوں اور نکات کی وضاحت کی گئی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ اور طالبات کے لیے، والدین اور بزرگوں کی طرف سے یہ کتاب ایک اچھا تحفہ ہو گا۔ کتابت، طباعت اور جلد خوب صورت اور قیمت مناسب ہے (ر - ہ) -

الصلوٰة والسلام علی رحمتہ للعالمین ﷺ، حصہ دوم، مرتبہ: رشید اللہ یعقوب، ناشر: رحمتہ للعالمین ریسرچ سنٹر، ۸۔ زمزمہ اسٹریٹ نمبر ۳، کلفٹن، کراچی ۷۵۶۰۰۔ صفحات: ۳۰۶۔ صدقہ جاریہ۔

حسن طباعت کا شاہکار یہ نقش ثانی، نقش اول کی آب و تاب کو دوچند کر دیتا ہے۔ پہلی جلد میں ۲۷ درود اور ۱۴ سلام تھے۔ اس دوسری جلد میں ۶۴ درود اور ۵ سلام ہیں۔ اس طرح مرتب نے احادیث کی تمام مستند کتب کھنگال کر کل ۹۰ درود اور ۱۹ سلام جمع کر دیے ہیں۔ حسن طباعت کے ساتھ ساتھ کتاب حسن ترتیب کا بھی نمونہ ہے۔ ایک باب میں درود و سلام کی فضیلت پر روایات جمع کر دی ہیں۔ رسول ﷺ اللہ کا ذکر، اللہ تعالیٰ کے ذکر کے تابع ہے، اس کی بنیاد پر ایک باب میں فضائل ذکر، فضائل تلاوت قرآن اور توبہ و استغفار کے بارے میں آیات و احادیث جمع کر دی ہیں۔ احادیث کے متن مع اعراب اور ترجمہ ہیں۔ صحت اور حوالے کا مکمل اہتمام ہے۔ جو درود صحیح اور حسن احادیث سے مروی ہیں، ان کی خوب صورت اور دل کش خطاطی پورے صفحے پر کروائی گئی ہے۔ غرض ایک غیر معمولی کاوش ہے جس کے حسن و صفات کا الفاظ میں بیان ناممکن سا ہے، دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مرتب کے اس عمل کو ان کے لیے توشۂ آخرت بنائے اور انھیں رسول ﷺ اللہ کا قرب عطا کرے۔ دبیز آرٹ پیپر پر شائع شدہ چار رنگوں کی طباعت سے مزین یہ کتاب ہدیہ کے لائق ہے اور مرتب اسے ہدیتاً ہی دیتے ہیں۔ صرف طلب کرنے کی زحمت ہے (مسلم سجاد) -

مدیر کے نام

مظفر حسین' لاہور

ایک ہی آیت کی تجلیات مختلف مفسروں کے قلوب پر جس طرح منعکس ہوئی ہیں ان کا یک جا کر کے پیش کرنا بہت ہی مفید اور عمدہ جدت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی کاوشوں کو قبول فرمائے۔

نصیر خان' نوشہرہ کلاں (نوشہرہ)

"مظفر بیگ مرحوم" (جون ۱۹۹۹) کے بارے میں مصنف نے زیادہ تر ان کے ماہنامہ آئین کے ساتھ تعلق پر کام کیا ہے' حالانکہ ان کی زندگی کے دیگر گوشوں کے بارے میں بھی قارئین کو کچھ نہ کچھ معلومات دینا چاہیے تھیں۔ مصنف کو ان کے بنیادی کوائف مثلاً تعلیم' پیدائش اور لاہور آمد کے بارے میں بھی یقینی معلومات نہیں ہیں۔

محمد عبداللہ صالح' بھکر

مولانا گوہر رحمٰن کا مضمون "سود کے جواز کے حیلے' ایک جائزہ" (جون ۱۹۹۹) ایک اہم اور عصری ضرورت کو پورا کرتا ہے اور ذہنوں میں موجود کئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتا ہے۔ قرآنیات پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

سید حامد عبدالرحمن الکاف' صنعاء' یمن

تذکرہ سید مودودی دوم و سوم کے مطالعے میں (مئی ۱۹۹۹) "مودودی اکیڈمی" کی تاسیس کی قابل تحسین اور واجب عمل تجویز پیش کی گئی ہے تاکہ سید مودودیؒ جیسی ہمہ پہلو شخصیت اور اس کے اثرات پر یکسوئی سے متخصصانہ انداز میں کام کیا جاسکے۔ اس سلسلے میں پہلی ضرورت یہ ہے کہ حیات شبلی کے طرز پر ایک ضخیم جلد میں سید مودودیؒ کی سیرت مدون کی جائے۔ مختلف موضوعات پر متخصصانہ کام کا آغاز کیا جا سکتا ہے (۲۷ موضوعات کی فہرست دی گئی ہے)۔ اکیڈمی کی اپنی مناسب عمارت ہو' جہاں سید مودودیؒ سے متعلق یادگار اشیا جمع کر دی جائیں۔ مالی وسائل جمع کیے جائیں' مناسب افراد آگے آئیں اور منصوبہ بندی سے کام کیا جائے۔

محمد درویش' پشاور یونی ورسٹی

الحمدللہ سید مودودیؒ کا ترجمان القرآن آپ کے زیر ادارت خرم مرادؒ کی فکر کی خوشبو لیے ہوئے ہے۔ اپریل کا ترجمان نظر سے گزرا۔ "اشارات"' "انقلاب کی حکمت عملی" اور "اقبال کا تصور جہاد" واقعی قابل تعریف ہیں اور دل کش بھی۔ بس ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے اقبال کا تصور جہاد میں ایک چیز کھٹکتی ہے کہ اقبال تصوف سے مایوس تھے' حالانکہ اقبال کی بنیاد تو تصوف ہے۔ یہ عقل و خرد پر عشق و جنون کی برتری جو کلام اقبال میں نظر آتی ہے' یہ عشق و جنون کیا ہے "تصوف ہی ہے۔ اقبال تو رومی' عطار' جامی سے متاثر ہے اور مولانا روم کو مرشد تصور کرتا ہے۔ اقبال کا مرد مومن تو دن کا مجاہد اور رات کا راہب ہے۔ اسلامی دنیا کی تحریکوں پر نظر ڈالی جائے تو مجدد الف ثانی' سید احمد شہید' بابا ثمرقندی' امام حسن البناؒ' امام خمینی' بدیع الزمان نورسی' مہدی سوڈان' حاجی صاحب ترنگزئی' یہ سارے تصوف کے کسی نہ کسی سلسلے میں ضرور منسلک تھے اس لیے ان تحریکات کا دنیا پر ابھی تک

اثر ہے۔ بغیر تصوف و تزکیہ' "تحریک پاکستان" کا حشر آپ کے سامنے ہے۔ بس عرض یہی ہے کہ اقبال کے مرد مومن' انسان کامل کے حرکت' جدوجہد' کوشش اور جہان نو کے خواب کو للہیت' تزکیے' تعلق باللہ' آہ صبح گاہی اور اشک سحرگاہی سے علاحدہ نہ کیجیے گا کہ ع بے اشک سحرگاہی تقویم خودی مشکل۔

ایک پاکستانی امریکن کرسچین ' نیویارک

میں ایک کرسچین ہوں اور ترجمان القرآن بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ اس لیے کہ اس میں معلومات کا خزانہ ہوتا ہے' کیونکہ ہمارا مذہب منع نہیں کرتا کہ ہم دوسرے مذہب کی معلومات لیں۔ خدا نے ہر انسان کو ایک جیسا پیدا کیا ہے۔ خدا کا سورج جب چمکتا ہے تو روشنی سب پر ہوتی ہے نہ کہ صرف مسلمان پر۔ جب خدا کی روشنی ہر انسان پر یکساں ہے تو پھر یہ مذہبی انتشار کیوں ہے؟ اب رہی بات لوئس فرح خان کی' جو یہاں امریکہ میں نیشن آف اسلام کا بانی ہے۔ تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کا جو اسلام ہے اس سے تو اچھے پاکستان کے کرسچین ہیں۔ کم از کم یہ خنزیر تو نہیں کھاتے اور شراب تو نہیں پیتے۔ میں اپنی بات کرتا ہوں۔ میں یہاں امریکہ میں پچھلے ۱۵ سال سے ہوں۔ میں آج بھی حلال گوشت کھاتا ہوں کیونکہ ہمارے مذہب میں بھی خنزیر حرام ہے (احبار' باب ۱۱' آیات ۷-۸) اور شراب بھی حرام ہے (احبار' باب ۱۰' آیات ۹-۱۰) یہاں تک کہ پانی کے جانور تک کون کون سے کھانے ہیں' کون کون سے نہیں (احبار' باب ۱۱' آیات ۹-۱۰) ہاتھوں پر' بازوؤں پر پھول بوٹے بنانا حرام ہے' جادو منتر کرنا (احبار' باب ۱۹' آیات ۲۰-۳۱) اور بہت کچھ ہے۔ سنگسار کرنے کی سزا' چور کا ہاتھ کاٹنا' یہ سب بائبل میں ثابت ہے۔ اب اگر ہم کرسچین قرآن کی باتوں کو جانتے ہیں تو سب ایک ہیں' فرق تو کچھ نہیں ہے۔

یہاں پر مسلمان ہیں' جیسا کہ ویسٹ انڈیز کے آپ دیکھ لیں' نام کے مسلمان ہیں' وہ سب کچھ کرتے ہیں جو گورے بھی نہیں کرتے۔ اب یہاں پر پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور ہیں' ہاتھ میں بیئر ہوگی' کہہ رہے ہوں گے گروسری اسٹور پہ حلال گوشت ہے۔ میں کیونکہ کرسچین ہوں ان لوگوں سے سوال کرتا ہوں' بھائی یہ جو تم نے ہاتھ میں بیئر کی بوتل پکڑی ہے یہ حلال ہے؟ تو جھگڑے پر اتر آتے ہیں۔ اب میں آپ کو کچھ یہاں کے کرسچین کی مثال دوں گا۔ یہاں پر کچھ فرقے ایسے ہیں جو اپنے گھر میں ریڈیو' ٹیلی وژن نہیں رکھتے اور ان کی عورتیں زندگی میں کبھی بال نہیں کاٹتیں' یہ طالبان سے بھی زیادہ سخت ہیں۔

مولانا عبدالخالق ' ژوب (بلوچستان)

اکیسویں صدی کی آمد آمد ہے۔ بیسویں صدی میں تجدید دین اور احیائے اسلام کے لیے امام ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی خدمات عظیم پر جامع مضامین ترجمان القرآن کی زینت بننا چاہییں۔ خصوصاً برعظیم ہند و پاک میں امام کی برپا کردہ تحریک "جماعت اسلامی" کے کارہائے نمایاں اور اسلامی دنیا پر اس کے ہمہ گیر اثرات کا جائزہ پیش کرنا چاہیے۔

محمد تشکیل ' ٹوبہ ٹیک سنگھ

"بحث و نظر" کا سلسلہ دوبارہ جاری فرمایئے۔ مغرب کی تازہ ترین سوچ اور پالیسیوں سے آگاہ رکھنے کا بندوبست بھی کیا جائے جس میں سرکاری سطح کے علاوہ غیر سرکاری سطح پر دانش ورانہ مطالعہ بھی شامل ہو۔ علاوہ ازیں "تہذیبوں کا تصادم" اور "تاریخ کا خاتمہ" نامی کتب کی تلخیص و تنقید بھی ترجمان میں آنا چاہیے۔ اس طرح مغرب میں چھپنے والی اہم اور تہلکہ خیز کتب بھی زیر مطالعہ لائی جائیں۔ ترجمان القرآن ماشاءاللہ خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہے ع اللہ کرے حسن ترجمان اور زیادہ۔

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵۔اے ذیلدار پارک 'اچھرہ' لاہور سے شائع کیا

C.P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE,